سات بہنیں

سات بہنیں

شِمالی افریقہ کی کہانیاں

فرخندہ لودھی

فہرست

قِسمت کا چکّر

کئی سو سال ہوئے، مراکش پر ایک بادشاہ حکُومت کرتا تھا۔ نام تھا، ابراہیم۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا۔ جب یہ بچّہ پیدا ہوا، بادشاہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اُس نے فوراً اپنے نجومی کو بُلایا تاکہ وہ بتائے کہ شہزادے کی قسمت میں کیا کیا ہے۔

نجُومی نے اپنی کتاب کھولی اور علمِ نجُوم کے حساب سے شہزادے کی قسمت کا حال دیکھا۔ جب نجُومی حساب کتاب کر رہا تھا تو بادشاہ نے دیکھا کہ اُس کے چہرے پر ایک رنگ آتا ہے اور ایک جاتا ہے۔ وہ بار بار کتاب کے صفحے اُلٹ پلٹ رہا تھا، جیسے اُس سے حساب کتاب میں غلطی ہو رہی ہو۔ جب کافی دیر گُزر گئی اور وہ کُچھ نہ بولا تو بادشاہ کے صبر کی انتہا نہ رہی۔ اُس نے پوچھا:

”جلدی بتایئے، ہمارے بیٹے کی قسمت میں کیا لکھا ہے؟“ ”بُری خبر ہے بادشاہ سلامت۔ آپ نہ ہی سُنیں تو اچھا ہے۔“ نجُومی نے عرض کیا۔ مگر بادشاہ نے اِصرار کیا اور کہا:

”میں اپنے بیٹے کی قِسمت کا حال جان کر رہُوں گا تا کہ اگر وہ کسی مُصیبت میں گرفتار ہونے والا ہے تو اُسے بچا سکوں۔ کم سے کم یہ تو بتائیے کہ اُسے کس چیز سے خطرہ ہے؟“

”بادشاہ سلامت، اگر آپ جاننا ہی چاہتے ہیں تو سُنیے۔ پہلا خطرہ تو ہے کہ آپ کے بیٹے کو شیر کھا جائے گا، اور اگر کِسی طرح وہ شیر کے پنجے سے بچ نِکلا تو اس کے بعد وہ ہو گا جو میں بتانا نہیں چاہتا۔ میں نہ منحوس بات اپنے منہ سے نہیں نکال سکتا۔“

”شیر کے کھا جانے سے زیادہ منحُوس بات کیا ہو سکتی ہے۔ آپ کہیں تو سہی۔“ بادشاہ نے ذرا سخت لہجے میں حُکم دیا۔ نجومی خاموش رہا۔

بادشاہ نے پہلے تو اُسے ڈرایا دھمکایا۔ پھر اُس کی منّتیں کیں۔ نجُومی پر بڑی مُشکل سے تھوڑا سا اثر ہوا اور وہ کچھ دیر بعد گلا صاف کرتے ہوئے بولا:

”بادشاہ سلامت، مجھے ڈر لگتا ہے۔“

”ڈر کس بات کا؟“

”عالی جاہ، اگر میں نے وہ سب کچھ بتا دیا، جو ستارے کہتے ہیں تو مجھے ڈر ہے کہ میری جان کی خیر نہیں۔“

”نہیں۔ ہر گز نہیں۔ میں قسم کھا کر کہتا ہُوں، تُم جو بھی کہو گے، صبر سے سنوں گا۔ تُمہارا بال بِیکا نہ ہونے دوں گا۔“

”بہت اچھّا، حضور۔“ نجومی نے اِطمینان کا سانس لیا۔ ”میں آپ کو سب کُچھ سچ سچ بتاتا ہُوں۔ ستارے کہتے ہیں کہ اگر شہزادہ شیر کا نوالہ بننے سے بچ گیا تو وہ آپ کو جان سے مار ڈالے گا۔“

بادشاہ نے چُپ سادھ لی۔ کُچھ دیر نجُومی کو ایسے دیکھتا رہا جیسے اُسے کُچھ سُنائی نہ دیا ہو۔ پھر دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا کر دُعا مانگی۔ دُعا کے بعد نجُومی سے بولا:

”جو کُچھ بھی ہو، میں اپنی اور اپنے بیٹے کی جان بچانے کی کوشش کروں گا۔ لیکن اے نجُومی، ستارے غَلَط بھی تو کہہ سکتے ہیں۔“

”ہاں، ستارے غلط بھی کہہ سکتے ہیں۔“ نجُومی نے بادشاہ کو خوش کرنے کے لیے کہہ دیا، ورنہ اُسے یقین تھا کہ ستارے غلط نہیں کہتے۔

بادشاہ ابراہیم نے اُسی وقت اپنی بد نصیبی کے ساتھ لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اُس نے محل سے کئی میل دُور پہاڑ کی چوٹی پر ایک الگ تھلگ جگہ تلاش کی جہاں انسان اور حیوان کسی کا گُزر نہ ہو۔ اُس جگہ اُس نے زمین کے اندر ایک تہہ خانہ بنوایا جس میں اُس کا بیٹا رہ سکے۔ اس تہہ خانے کا ایک ہی دروازہ تھا۔ اُس دروازے کو درختوں اور جھاڑیوں سے اچھی طرح ڈھانپ دیا گیا تھا۔

جب تہہ خانہ مکمّل ہو گیا تو معصُوم شہزادے کو اس میں اُتار دیا گیا۔ اس وقت شہزادے کی عُمر ایک ڈیڑھ سال تھی۔ اس کی آیا اس کے ساتھ تھی۔ دونوں اس تہہ خانے میں رہنے لگے۔ دن، مہینے اور سال گُزر گئے۔

بادشاہ مہینے میں ایک بار اپنے درباریوں کے ہمراہ اس تہہ خانے پر آتا۔ دروازے سے نیچے کمرے میں سیڑھی لگا دی جاتی۔ شہزادہ اور اُس کی آیا دونوں اس سیڑھی کے ذریعے باہر آتے۔ بادشاہ بیٹے کو گود میں لے کر پیار کرتا اور دیر

تک اُس کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ پھر ٹھنڈی آہ بھر کر آیا کو حکم دیتا کہ وہ بچّے کو لے کر نیچے چلی جائے اس کے بعد وہ گھوڑے پر سوار ہوتا اور غم زدہ دل کے ساتھ محل میں واپس آجاتا۔

یہی قصّہ چلتا رہا اور ابراہیم کا بیٹا سات برس کا ہو گیا۔ ایک روز اِتّفاق سے شکاریوں کی ایک ٹولی ایک شیر کے پیچھے اُدھر آنِکلی۔ وہ لوگ شیر کو گھیرنا چاہتے تھے اور شیر کہیں چھُپ جانا چاہتا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا اُس جگہ پہنچا جہاں تہہ خانہ بنا ہوا تھا۔ جوں ہی شیر کا بھاری جسم غار کے دہانے پر اُگی ہوئی گھاس اور جھاڑیوں پر پڑا، وہ تہہ خانے کے اندر جاگِرا۔

شیر جھلّایا ہوا تھا اور اُسے بھُوک بھی لگی تھی۔ اُس کی نظر شہزادے پر پڑی تو اُس نے اُس پر حملہ کر دیا۔ شہزادہ بے ہوش ہو کر گِر پڑا۔ اُس کا کندھا زخمی ہو گیا تھا۔ آیا اُس کو بچانے کے لیے آئی تو بپھرے ہوئے شیر نے اُس کی تِکّا بوٹی کر دی۔ شہزادہ تہہ خانے کے فرش پر بے ہوش پڑا تھا۔

اس عرصے میں شکاری شیر کو تلاش کرتے ہوئے تھے تہہ خانے کے پاس آپہنچے۔

یہاں آ کر اُنہیں پتا چلا کہ شیر کے دھاڑنے کی آواز زمین کے اندر سے آ رہی ہے۔ اُنہوں نے نیچے جھانک کر دیکھا تو تہہ خانے میں شیر موجود تھا۔ اُنہوں نے شیر پر پتھروں کی بارش کر دی، یہاں تک کہ اُسے جان سے مار دیا۔ پھر اُنہوں نے رسّے کی سیڑھی بنائی اور بڑی ہوشیاری سے تہہ خانے میں اُتر گئے۔

تہہ خانے کی بناوٹ اور سجاوٹ دیکھ کر شکاری بُہت حیران ہوئے۔ تہہ خانے میں کئی کمرے تھے اور ہر کمرے میں قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے۔ چھتوں پر فانُوس لٹک رہے تھے۔ کمروں کو اتنے قیمتی سامان سے سجایا گیا تھا کہ پہلی نظر میں ہی پتا چل جاتا تھا کہ یہ کِسی شہزادے کا گھر ہو گا۔

شکاری ہر جگہ کی تلاشی لے رہے تھے اور جو کچھ اُٹھا سکتے تھے، اُس کو لے جانے کے لیے باندھ رہے تھے۔ اچانک اُن کو احساس ہوا کہ عورت تو مر چُکی ہے مگر بچّے میں ابھی سانس باقی ہے اور وہ بے ہوش ہے۔ وہ سامان کے ساتھ بچّے کو بھی ساتھ لے گئے۔

اس طرح سات برس کا شہزادہ شکاریوں کے ہاں پہاڑوں میں رہنے لگا۔ اُس نے

یہاں گھڑ سواری سیکھی اور جانوروں کا شکار کرنے میں مہارت حاصل کی۔ اُن شکاریوں میں اچھّے بُرے کی تمیز نہ تھی، اس لیے وہ بعض اوقات قافلوں پر حملہ کر کے اُن کو لُوٹ لیتے اور مال مویشی ہانک کر لے جاتے۔ ان سب کاموں میں شاہ ابراہیم کا بیٹا ان کے ساتھ ہوتا۔ شکاریوں کے ساتھ رہ کر وہ بھی ان جیسا لاپرواہ اور جسمانی طور پر مضبُوط ہو گیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے اور کون اُس کے ماں باپ ہیں۔ وہ تو شکاریوں میں شکاری تھا اور لُٹیروں میں لُٹیرا۔

ایک روز شام کے وقت شہزادے اور اُس کے دوسرے ساتھیوں نے ایک قافلے پر حملہ کیا۔ اُس وقت شہزادے کی عمر اکیس برس کی ہو چکی تھی۔ اِتّفاق سے یہ قافلہ بھی ہتھیاروں سے خُوب لیس تھا۔ قافلے والوں نے ڈاکوؤں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ خوں ریز جنگ ہوئی۔ شہزادہ زخم کھا کر بے ہوش ہو گیا۔ اگلی صبح جب اُسے ہوش آیا تو وہ تنہا تھا۔ قافلے کا کہیں نام و نشان نہ تھا اور اُس کے ساتھی بھی کہیں نظر نہ آتے تھے۔ وہ مارے گئے تھے؟ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا۔

شہزادہ ہمّت کر کے اُٹھا۔ اُس کے زخموں سے خُون رِس رہا تھا اور پورا جسم

پھوڑے کی مانند دُکھ رہا تھا۔ اُس نے اِرد گرد نگاہ دوڑائی تو دُور دُور تک کوئی نظر نہ آیا۔ آخر ہمّت کر کے وہ اُس راستے پر چلنے لگا جِدھر سے ایک دن پہلے وہ اور اُس کے ساتھی آئے تھے۔ اُس کا خیال تھا کہ اِس طرح شاید وہ اپنے ساتھیوں سے جا ملے۔

ابھی وہ زیادہ دُور نہیں گیا تھا کہ اُسے ایک شخص ملا جو کسی خزانے کا کھوج لگا رہا تھا۔ یہ کھوجی بھی عجیب قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ پگلے سے، دیوانے سے۔ لیکن ان میں ایک خاص بات ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ یہ لوگ اپنی دُھن کے پکّے ہوتے ہیں اور چھُپے ہوئے خزانوں کی تلاش میں جنگل جنگل، صحرا صحرا گھومتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات دوسرے لوگ اُن کو مُلازم رکھ لیتے ہیں۔ ان لوگوں کی مُہمیں بڑی خطرناک ہوتی ہیں۔ دبے ہوئے خزانے کو نکالنے کے لیے اُنہیں زمین کو دُور کھودنا پڑتا ہے اور کھودتے کھودتے یہ پاتال تک پہنچ جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض کو دوبارہ اس دُنیا میں آنا نصیب نہیں ہوتا، اور بعض اپنی عقل کھو بیٹھتے ہیں۔

خزانوں کے کھوجی نے ابراہیم کے بیٹے کو رُوک کر پوچھا:

"کہاں جارہے ہو؟"

"کہیں نہیں۔" شہزادے نے جواب دیا۔

"کہاں سے آئے ہو؟"

"زمین کے اندر سے۔" شہزادے نے جواب دیا اور پھر اپنی ساری داستان کہہ سُنائی۔

"اوہ! پھر تو تم میرے کام کے آدمی ہو۔" کھوجی نے خُوش ہو کر کہا۔ "آؤ میرے ساتھ چلو۔ ہم مل کر خزانوں کا کھوج لگائیں گے۔"

شہزادہ اُس کے ساتھ اُس کے خیمے میں پہنچا۔ اس خیمے میں وہ دونوں کئی دن رہے۔ کھاتے پیتے، گپیں لگاتے اور پھر سو جاتے۔ آخر شہزادے کی صحت ٹھیک ہو گئی۔ اب وہ پھر پہلے جیسا طاقت ور ہو گیا تھا۔

ایک دن دونوں خزانے کی کھوج میں پہاڑوں کی طرف روانہ ہوئے۔ گدھوں پر

سوار تھے۔ کھوجی آگے آگے تھا کیوں کہ وہی ان راستوں سے واقف تھا۔ آخر پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ ایک خاص جگہ پر رُک کر کھوجی نے جیب سے نقشہ نکالا۔ غور سے دیکھ کر اِرد گرد نگاہ دوڑائی، ہر طرف گھُوم پھر کر دیکھا اور پھر اُسے تسلّی ہو گئی کہ وہ ٹھیک جگہ پہنچے ہیں۔

یہاں کھوجی نے اپنی چھتری زمین میں سیدھی گاڑ دی اور کہا:

دونوں نے مل کر زمین کو کھودنا شروع کیا۔ اچانک اُن کی کُدالیں ایک پتھّر سے ٹکرائیں۔ یہ پتھّر ایک بہت بڑی سی چکّی کی مانند تھا۔ دونوں نے خوب زور لگا کر پتھّر کو ایک طرف ہٹایا تو نیچے ایک کنواں نظر آیا۔ کھوجی نے ایک مضبُوط سا رسّا شہزادے کی کمر میں کس کر باندھ دیا، موم بتّی جلا کر اُس کے ہاتھ میں تھما دی اور کہا:

''اس کنویں میں اُتر جاؤ۔ میں رسّے کو ہولے ہولے ڈھیل دیتا جاؤں گا۔ تہہ میں پہنچ جاؤ تو آواز دینا۔ میں ٹوکری لٹکا دوں گا۔ میرا خیال ہے کنویں میں اتنا سونا ہے کہ ہم نے دس بارہ ٹوکریاں بھی کھینچ لیں تو ساری عُمر کسی شے کی ضرورت نہیں

رہے گی۔"

کھوجی کے کہنے کے مُطابق شہزادہ کنویں میں اُتر گیا۔ خوف کے مارے اُس کا دم نکل رہا تھا۔ موم بتّی کو جلائے رکھنا ضروری تھا، ورنہ اندھیرے کنویں میں کُچھ نظر نہ آتا۔ پیندے پر پاؤں لگتے ہی اُس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ کنویں میں پانی نہیں تھا۔ پانی کی جگہ سونا بھرا ہوا تھا۔

شہزادے نے زور سے کہا "سونا ہے۔۔۔"!

اُسی وقت اُوپر سے رسّے میں بندھی ہوئی ٹوکری نیچے آئی۔ شہزادے نے ٹوکری کو سونے سے لبالب بھر دیا۔ کھوجی نے ٹوکری اُوپر کھینچ لی۔ پھر دوسری ٹوکری اُوپر گئی، پھر تیسری، پھر چوتھی۔۔۔ پانچویں ٹوکری اوپر جا کر واپس نہیں آئی۔

شہزادہ کچھ دیر انتظار کرتا رہا۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اچانک گڑگڑاہٹ سی ہوئی۔ اب شہزادہ مکمّل اندھیرے میں تھا۔ کنویں کا مُنہ بند کر دیا گیا تھا۔ اس کی موم بتّی بھی بُجھ چُکی تھی۔

اصل میں کھوجی کی نیّت خراب تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شہزادہ اُس کے ساتھ دولت میں حصّے دار بنے۔ جوں ہی سونا اُس کے ہاتھ لگا، اُس نے اُسے گدھے پر لادا، کنویں پر پتھّر رکھا اور خُوشی خُوشی اپنے گھر کی راہ لی۔

کھوجی کے دھوکا دینے پر پہلے تو شہزادے کو بے حد دُکھ ہوا، مگر پھر اُس نے یہ کہہ کر دل کو تسلّی دے لی کہ موت اور زندگی خُدا کے ہاتھ میں ہے۔ اگر اللہ کو میری زندگی منظور ہے تو وہ کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی دے گا۔

یہ سوچ کر شہزادے کا حوصلہ کُچھ بڑھا اور وہ آنے والے وقت سے بے فکر ہو گیا۔ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہوئے اچانک اُس کی نظر اُدھر پڑی جِدھر اُس کے خیال میں خانہ کعبہ تھا۔ شہزادے نے مکّے کی طرف مُنہ کر کے ظہر کی نماز ادا کی۔ وہ سجدے میں گِرا ہوا دُعا کر رہا تھا کہ اُسے پانی گِرنے کی مدھم سی آواز سُنائی دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کہیں دُور جھَرنا گِر رہا ہو۔ وہ ٹٹولتا ٹٹولتا اُسی سَمت چل دیا۔

کنویں میں ایک جانب چٹانوں کے درمیان سے راستہ باہر کو جاتا تھا مگر یہ راستہ اتنا

تنگ تھا کہ آدمی رینگ کر ہی گُزر سکتا تھا۔ وہ جُوں جُوں آگے بڑھا، پانی گِرنے کی آواز زیادہ صاف سُنائی دینے لگی۔ آخر وہ اُس جگہ پر پہنچ گیا جہاں سے چشمہ پھُوٹتا تھا۔ یہاں سخت سردی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ساری سردی یہیں سے نکل کر پہاڑوں پر پھیلتی ہے۔

”ٹھیک ہے۔“ شہزادے نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ ”اگر خُدا کی یہی مرضی ہے تو بسم اللہ۔ میں اِسی راستے پر چلوں گا۔ زندگی اور موت تو خُدا کے ہاتھ میں ہے۔“ یہ کہا اور بے جھجک پانی میں کُود گیا۔ پانی کی تیز لہریں اُسے کہیں سے کہیں لے گئیں۔ اندھیری اور لمبی سُرنگوں میں سے ہوتا ہوا وہ ایک ایسے سفر پر جا رہا تھا جس کے متعلّق اُسے کچھ معلوم نہ تھا پھر اُسے اپنے سامنے روشنی نظر آئی اور یُوں لگا کہ وہ اب چٹانوں سے نکل کر ایک خُوب صُورت ہری بھری وادی میں بہہ رہا ہے۔

اس وادی میں پہنچ کر شہزادے پر دُھوپ کی گرم کرنیں پڑیں تو اُسے کچھ ہوش آیا۔ ہمّت کر کے وہ دریا کے کنارے کی طرف تیرنے لگا۔ پھر پتھّروں کا سہارا

لے کر دریا سے باہر آ گیا۔ کافی دیر تک کنارے پر لیٹا دھوپ تاپتا رہا۔ سُورج کی گرمی سے اُس کے جسم میں طاقت آ گئی۔ کپڑے بھی سُوکھ گئے۔ اب بھُوک نے ستایا تو وہ آہستہ آہستہ دریا کے بہاؤ کے ساتھ چلنے لگا۔ اُسے یقین تھا کہ دریا کسی نہ کسی گاؤں یا شہر کے پاس سے گُزرتا ہو گا کیوں کہ عام طور پر بستیاں دریاؤں کے کنارے ہی آباد کی جاتی ہیں۔

اُسے زیادہ چلنا نہیں پڑا۔ تھوڑے فاصلے پر اُسے چند خیمے نظر آئے۔ خیمے میں رہنے والے لوگ شہزادے کو کچھ عجیب سے لگے۔ وہ شہزادے کو دیکھ کر بالکل خوش نہ ہوئے لیکن جب شہزادے نے اُنہیں یہ بتایا کہ وہ کِس طرح موت کے مُنہ سے بچ کر آیا ہے اور دُنیا میں اُس کا کوئی نہیں تو اُن کو رحم آ گیا۔ اُنہوں نے اُسے کھانے پینے کو دیا اور اپنے پاس رہنے کی اجازت بھی دے دی۔

جُوں جُوں وقت گزرتا گیا۔ وہ لوگ شہزادے کے دوست بنتے گئے۔ بُہت دِنوں بعد شہزادے کو پتا چلا کہ ان لوگوں نے شروع میں اُسے کیوں ناپسند کیا تھا۔ دراصل یہ لوگ قزّاق (ڈاکو) تھے اور قافلوں کو لُوٹ کر اپنا اور اپنے بیوی بچّوں

کا پیٹ پالتے تھے۔ وہ شہر سے باہر گھات لگائے بیٹھے رہتے۔ جُوں ہی کوئی قافلہ شہر میں داخل ہوتا یا باہر نِکلتا، اُسے لُوٹ لیتے۔ یہ شہر ابراہیم بادشاہ کی سلطنت ہی میں تھا۔ شہزادے کو اِن قزّاقوں کی زندگی بے حد پسند آئی۔ وہ جلد ہی اُن میں گھُل مِل گیا۔

”میری قسمت میں یہی لکھا تھا۔ میں اِنہیں کے ساتھ رہوں گا۔“ شہزادے نے اپنے آپ کو سمجھایا اور قزّاقوں میں شامل ہو گیا۔

کئی مہینے گزر گئے۔ شہر کے لوگوں نے بادشاہ سے درخواست کی کہ ہمیں قزّاقوں کی لُوٹ کھسُوٹ سے بچایا جائے۔ لُٹیروں کے ہاتھوں اُن کی جان ہر وقت خطرے میں ہے۔ شاید ہی کوئی قافلہ ہو گا جو بغیر لُٹے پٹے شہر میں داخل ہوا ہو۔ سوداگروں نے کاروبار کرنا چھوڑ دیا ہے۔ بازار خالی پڑے ہیں۔ کھانے کی چیزوں کی قیمتیں چڑھ گئی ہیں، غریبوں کی حالت بہت خراب ہے۔

بادشاہ ابراہیم کو جب یہ خبر ملی تو اس نے ڈاکوؤں سے نمٹنے کا فیصلہ کیا اور ایک فوجی دستہ لے کر شہر سے روانہ ہو گیا۔ تقریباً بیس میل کا سفر طے کرنے کے بعد

فوج ڈاکوؤں کے سر پر جا پہنچی اور اُس نے اُن پر اچانک حملہ کر دیا۔ دونوں طرف کے آدمی بہادری سے لڑے۔ لیکن ڈاکو تعداد میں کم تھے اس لیے شاہی فوج کا پلّہ بھاری رہا۔ شام ہونے تک ڈاکوؤں کے بہت سے ساتھی یا تو مارے گئے یا قیدی بنا لیے گئے۔

شہزادے کو اس جنگ میں بڑا لُطف آ رہا تھا اور وہ بڑی بے جگری سے لڑ رہا تھا۔ جب اُس نے دیکھا کہ اُس کے ساتھی کٹ کٹ کر گِر رہے ہیں تو چند ساتھیوں کو لے کر پیچھے ہٹ گیا اور شاہی فوج پر تیر برسانے لگا۔ ایک تیر بادشاہ کے سینے میں جا لگا۔ شاہی فوج جیت چکی تھی، اس لیے بادشاہ نے زخم کی پروانہ کی اور شہر میں آ گیا۔ وہ بڑی مُشکل سے گھوڑے سے اُترا۔ طبیبوں کو بُلایا گیا۔ مگر سینے کا زخم اتنا گہرا تھا کہ بادشاہ کی زندگی کی کوئی اُمّید نہ رہی۔

اسی حالت میں کئی دن گُزر گئے۔ آخر کار طبیبوں نے بتایا کہ بادشاہ کا آخری وقت آ گیا ہے، وہ اُسے نہیں بچا سکتے۔ اس موقع پر بادشاہ نے اپنے نجُومی کو بُلایا اور کہا:

"کئی برس گُزرے، تُم نے بتایا تھا کہ اگر میرا بیٹا شیر کا لُقمہ نہ بنا تو وہ مجھے مار ڈالے

گا۔"

"جی ہاں، عالی جاہ۔" نجُومی نے جواب دیا۔

"اور تُم کو یہ بھی یاد ہو گا کہ جب ہم نے اُس تہہ خانے کی تلاشی لی تھی جس میں شہزادے کو رکھا گیا تھا تو وہاں آیا اور شیر کی لاشوں کے سوا کچھ نہ ملا تھا۔"

"جی۔۔۔" نجومی نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"تو پھر اے نجُومی، میرے بیٹے کو کِسی مُعجزے نے شیر کے پنجے سے بچا لیا ہے اور یہ نوجوان وہی ہونا چاہیے کیوں کہ میری موت اُسی کے ہاتھوں لکھی ہے۔ مگر میں اس وقت ایک ڈاکُو کے تیر سے مر رہا ہوں۔ کیا یہ مُمکن ہے؟"

"حضور، اگر آپ کا بیٹا زندہ ہے تو وہ ڈاکوؤں کے اس گروہ میں شامل ہے۔"

بادشاہ نے جب یہ سُنا تو حکم دیا کہ قیدیوں کو اُس کے سامنے لایا جائے۔ جب وہ آئے تو بادشاہ نے اُن سے پُوچھا: "تُم میں سے کِس کے تیر سے میں زخمی ہُوا ہُوں؟"

ایک ڈاکو آگے بڑھا اور ایک نوجوان کی طرف اِشارہ کرتے ہُوئے بولا۔ ”اے بادشاہ، آپ اِس نوجوان کے تیر سے زخمی ہُوئے ہیں۔ یہ نوجوان چند مہینے پہلے ہمارے گروہ میں شامل ہوا تھا۔ ہم میں سے کوئی بھی اِس کے بارے میں نہیں جانتا کہ یہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔“

ابراہیم نے نوجوان سے پوچھا:

”تمہارانام کیا ہے، اور تُم کہاں کے رہنے والے ہو؟“

”مجھے اِبن ابراہیم (یعنی ابراہیم کا بیٹا) کہتے ہیں۔ یہی میرا نام ہے۔ اس کے سوا میں اور کُچھ نہیں جانتا۔ مجھے نہیں معلُوم میرا باپ کون تھا۔ بس اتنا یاد ہے کہ جب میں بچّہ تھا تو ایک تہہ خانے میں رہا تھا۔ میرے ساتھ میری آیا تھی۔ پھر ایک دن وہاں ایک شیر آیا اور اُس نے ہم دونوں پر حملہ کر دیا۔ میری آیا مر گئی۔ میں زخمی ہو گیا۔“

شہزادے نے بادشاہ کو بتایا کہ کِس طرح شکاریوں نے اُس کی پرورش کی، وہ زخمی ہوا تو کِس طرح خزانوں کے کھوجی نے اُس کی دیکھ بھال کی، اُسے کنویں میں اُتارا

اور سارا سونا لے کر رفوچکّر ہو گیا۔ پھر کنویں میں کِس طرح اُسے چشمے کا پتا چلا اور وہ کُنویں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر وہ قزّاقوں کے گروہ میں شامل ہو کر قافلوں کو لوٹنے لگا۔

ساری کہانی سُنا کر شہزادے نے بادشاہ سے درخواست کی:

"بادشاہ سلامت، میرے ساتھیوں کو آزاد کر دیجیے۔ آپ میرے تیر سے زخمی ہوئے ہیں۔ اِن کا کوئی قصُور نہیں۔"

"یہی میرا بیٹا ہے۔" ابراہیم نے کہا۔ پھر باقی قیدیوں کے بارے میں حکم دیا۔ "اگر یہ قسم کھائیں کہ آیندہ لُوٹ مار نہیں کریں گے تو انہیں آزاد کر دیا جائے۔"

اس کے بعد ابراہیم نے اپنے وزیروں کو بُلایا اور کہا:

"خُدا جو قسمت میں لکھ دیا ہے وہ پورا ہو کر رہتا ہے۔ اب میرے تخت و تاج کا مالک میرا بیٹا ہے۔"

یہ کہہ کر اُس نے پاس کھڑے حیران پریشان شہزادے کو گلے لگایا اور تاج اُس

کے سر پر رکھ دیا۔ پھر ایسے لیٹ گیا جیسے بہت تھک گیا ہو۔ ابراہیم کے چہرے پر عجیب مُسکراہٹ تھی۔ اس سے پہلے کہ بیٹا باپ سے کچھ کہے، بادشاہ ہمیشہ کی نیند سو گیا۔

سات بہنیں

ایک دفعہ کا ذکر ہے، تیونس میں قالینوں کا کوئی سوداگر رہتا تھا۔ اس کی سات بیٹیاں تھیں۔ بیٹا کوئی نہ تھا۔ بیوی مر چکی تھی۔ اس نے دوسری شادی اس لیے نہیں کی تھی کہ سوتیلی ماں نہ معلوم بچیوں کے ساتھ کیسا سلوک کرے۔

سوداگر اپنی بچیوں کے ساتھ ایک بہت بڑی حویلی میں رہتا تھا۔ اُن کا ایک اور ساتھی بھی تھا، اور وہ تھا ایک کتّا جس کا نام زنادہ تھا۔

زنادہ سب سے چھوٹی بہن عائشہ کا لاڈلا تھا۔ اُسی نے اسے پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ عائشہ اُس کو کھلاتی پلاتی، نہلاتی دُھلاتی اور اُس کے ساتھ کھیلتی۔ وہ زنادہ سے اس طرح باتیں کرتی جیسے وہ انسان ہو۔

زنادہ اصل میں کُتّا نہیں، جِن تھا اور جِن بھی خوش مزاج اور انسانوں سے محبّت کرنے والا۔ بس دل بہلانے کے لیے وہ کتّے کی شکل میں سوداگر کے گھر رہنے لگا

تھا۔ سوداگر ہر روز صُبح سویرے بازار جا کر اپنی دکان کھولتا، قالین باہر نِکالتا اور سجا کر رکھ دیتا۔ دوپہر کو تھوڑی دیر کے لیے کھانا کھانے گھر آتا پھر دُکان پر چلا جاتا، اور شام تک مصرُوف رہتا۔ اس کی زندگی اسی طریقے سے گُزر رہی تھی۔

ایک روز دُکان سے واپسی پر وہ مسجد کے سامنے سے گُزر رہا تھا کہ ایک ڈھنڈورچی کی آواز سنائی دی:

''اے مسلمانو! خُدا کو یاد کرو۔ صرف وہی بھروسے کے قابل ہے۔ اے گناہ گارو! خُدا سب کُچھ دیکھتا ہے۔ اُسی کی تعریف کرو۔ یاد رکھو، حج کرنا ہر مال دار مُسلمان پر فرض ہے۔ آپ میں سے جو بھی خُدا کا گھر دیکھنا چاہتا ہے، رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے روضے کی زیارت کرنا چاہتا ہے، اُس کو اِطّلاع دی جاتی ہے کہ حاجیوں کا قافلہ مکّے کے سفر پر اس مہینے کی پانچ تاریخ کو روانہ ہو گا۔''

سوداگر نے یہ منادی سُنی تو اُس کے دل میں تمنّا پیدا ہوئی کہ وہ بھی حج کے لیے جائے۔ اُس نے پکّا ارادہ کر لیا کہ وہ اس سال مکّے ضُرور جائے گا اور خُدا کے گھر میں حاضری دے گا۔ وہ جلدی جلدی گھر پُہنچا اور بیٹیوں سے کہا: ''میری پیاری

بیٹیو! تُم دیکھ رہی ہو کہ میرے بال سفید ہو چکے ہیں لیکن میں نے ابھی تک حج کا فرض ادا نہیں کیا، اور نہ رسُولِ مقبول حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کا روضۂ مُبارک دیکھا ہے۔ اس سال میں یہ فرض ضرور پُورا کروں گا۔ لیکن میری بچّیو، اگر میں حج کرنے گیا تو مُجھے تُمہاری فکر لگی رہے گی۔ میرے پیچھے تُمہاری دیکھ بھال کون کرے گا؟"

یہ سُن کر اُس کی بیٹیاں اداس ہونے کے بجائے خُوش ہوئیں اور بڑی لڑکی کہنے لگی:

"ابّا جان، آپ ضرور تشریف لے جائیں اور ہماری فکر نہ کریں۔"

"زنادہ ہماری حفاظت کرے گا۔" عائشہ نے بھی باپ کو تسلّی دی۔

لڑکیوں نے خُوشی خُوشی باپ کا سامان باندھ دیا۔ کھانے پینے کی کچھ چیزیں پکا کر ساتھ کر دیں۔ کُچھ چیزیں کچّی بھی باندھ دیں تاکہ باپ کو لمبے سفر میں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ اس زمانے میں تیونس سے مکّے جانے اور واپس آنے میں ایک سال لگ جاتا تھا۔

سوداگر نے بیٹیوں کے لیے سال بھر کا کھانے پینے کا سامان گھر میں ڈال دیا۔ ضرورت کی ہر چیز خرید کر دے دی تا کہ لڑکیوں کو کسی قسم کی تنگی نہ ہو۔ پھر اُس نے اُنہیں نصیحت کرتے ہوئے کہا:

”گھر سے باہر قدم نہ رکھنا۔ کوئی بھی آئے، دروازہ ہر گز نہ کھولنا۔“

”جب تک آپ نہیں آئیں گے، ہم دروازہ نہیں کھولیں گے۔“ لڑکیوں نے وعدہ کیا۔

سوداگر نے بیٹیوں کو گلے لگا کر پیار کیا اور پھر اُنہیں خُدا کے حوالے کر کے حج پر روانہ ہو گیا۔ اُسے یقین تھا کہ زنادہ کی موجودگی میں کوئی بھی گھر کے اندر داخل ہونے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔

لڑکیوں نے دروازے کو اچھی طرح بند کر لیا اور حویلی میں آرام سے رہنے لگیں۔ زنادہ اُن کے ساتھ تھا۔ وہ سارا دن صحن میں کھیلتا اور رات کو عائشہ کی پائینتی سو جاتا۔

کئی ہفتے گُزر گئے۔ ایک دن دروازے پر زور زور سے تین بار دستک ہوئی۔ پھر ایک عورت کی آواز آئی:

"دروازہ کھولو"!

ساتوں بہنیں دروازے کے پاس جمع ہو گئیں اور پُوچھا: "کون ہیں آپ؟"

باہر کھڑی عورت بڑی نرمی سے بولی۔ "پیاری بھانجیو، میں تُمہاری خالہ ہوں۔ تُمہاری امّی کی سگی بہن۔"

عائشہ نے فوراً کہا۔ "میرا خیال ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، بڑی بی۔ ہماری تو کوئی خالہ نہیں۔ ہماری امّی جان ہمارے ابّا جان کی طرح اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ اس لیے ہماری نہ تو کوئی خالہ ہے نہ ماموں۔ ابّا جان کے سوا ہمارا کوئی رشتے دار نہیں۔ البتہ خُدا ہے کو سب کا ہے۔"

"احمق لڑکی!" عورت نے باہر سے جواب دیا۔ "تُم تو اُس وقت پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں جب میری شادی ہوئی اور میں اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر پردیس چلی

گئی۔ بڑی پیاری بچیاں ہو تُم تو۔ شاباش! دروازہ کھولو۔۔۔ دیکھو، میں بہت تھک گئی ہُوں اور باہر دھوپ اتنی تیز ہے کہ بھیجا پگھلا جا رہا ہے۔ کوئی سایہ بھی نہیں کہ اس کے نیچے کھڑی ہو جاؤں۔ بڑی اچھی ہو تُم۔ جلدی سے کھولو۔ تھوڑی دیر آرام کر کے تُمھیں مزے مزے کی کہانیاں سُناؤں گی۔ دُوسرے مُلکوں کے بارے میں بتاؤں گی۔ تُمھاری امُی اور نانی کے بارے میں بتاؤں گی۔" بہنوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر مشورہ کرنے لگیں۔

"نہیں۔ ہر گز نہیں۔" عائشہ نے کہا۔ "خدا کے واسطے دروازہ نہ کھولنا۔ مُجھے یقین ہے یہ عورت ہماری خالہ نہیں۔ اگر یہ سچ مُچ ہماری خالہ ہے تو بھی ہمیں دروازہ نہیں کھولنا چاہیے، کیوں کہ ابّا جان نے سختی سے منع کیا تھا اور آپ یہ بھی جانتی ہیں جو اپنے ماں باپ کا کہا نہیں مانتے بڑے بدنصیب ہوتے ہیں۔"

زنادہ پاس ہی کھڑا تھا۔ وہ ایک دم بھونکنے لگا "بھوں بھوں، یعنی میں زنادہ ہوں، آپ سب کا رکھوالا ہوں۔ جو کوئی بھی آپ کو نقصان پہنچائے گا، میں اُس کی بوٹیاں کر دُوں گا۔"

کُتّے کی آواز سُن کر نقلی خالہ وہاں سے کھسکتے ہوئے بولی:

”چھُو! کتنی گندی بُو آ رہی ہے اس کتّے سے۔“

زنادہ جِن تھا۔ اِس لیے وہ بُڑھیا کی آواز سے ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ کون ہے۔ اصل میں وہ چُڑیل تھی زنادہ کو معلوم تھا کہ وہ بچّیوں کو کھانے کے لیے آئی ہے اور چڑیل بھی یہ جانتی تھی کہ جب تک یہ جِن بچّیوں کی نِگرانی کر رہا ہے وہ ان کو نہیں کھا سکتی کیوں کہ جِن بھُوتوں اور چُڑیلوں کے جانی دُشمن ہوتے ہیں۔

ساری رات چُڑیل گھر کے اِرد گرد منڈلاتی رہی۔ رات کے وقت وہ اپنی اصلی شکل میں گھوم رہی تھی۔ یہ لمبے لمبے تیز دانت، بال ایسے جیسے سانپ کنڈلی مارے بیٹھے ہوں۔ وہ زور زور سے چیخ رہی تھی:

”اس گھر میں سات چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ہیں۔ کل میں ان سب کو چٹ کر جاؤں گی۔“

کُتّا ساری رات بھونکتا رہا۔ ”بھوؤں بھوؤں۔ میں بھی زنادہ ہوں۔ ان بچّیوں کا

رکھوالا۔ تُو اِن کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔"

اگلے روز چُڑیل پھر عورت کے بھیس میں آئی اور دروازہ کھٹکھٹا کر بولی:

"پیاری بھانجیو، دروازہ کھولو۔ میں تُمہیں دیکھ کر آنکھوں کو ٹھنڈا کروں گی۔ میری مری ہوئی بہن کی نشانی ہو تُم۔ دیکھو میں تُمہارے لیے دیس دیس کے تُحفے لائی ہوں۔"

جب چُڑیل نے یہ کہا تو باقی چھ بہنیں دروازہ کھولنے کے لیے دوڑیں۔

"نہ نہ۔" عائشہ نے چیخ کر کہا۔ "ہم نے ابّا سے وعدہ کیا تھا کہ اس وقت تک دروازہ نہیں کھولیں گے جب تک وُہ خُود نہ آئیں۔ اور پھر ہمارا کُتّا زنادہ ساری رات بھونکتا رہا ہے۔ وہ ہمیں بتا رہا تھا کہ دروازہ مت کھولنا۔ یہ عورت چُڑیل ہے۔"

عائشہ نے اپنی بہنوں کو بُہت منع کیا، ان کو بہت روکا لیکن بہنوں نے سختی سے اُسے پرے دھکیل دیا اور بُرا بھلا کہنے لگیں۔

"تم تو بے وقوف ہو۔ تم اور تُمہارا کُتّا دونوں۔ ہماری خالہ آئی ہیں اور ہم دروازہ نہ

کھولیں۔ واہ! فرض کرو وُہ سچ مچ کی خالہ نہیں ہے تو کیا فرق پڑے گا۔ ایسی نرم دل بڑھیا ہمارا کیا بگاڑ سکتی ہے۔ وہ ہمارے لیے تُحفے لے کر آئی ہے۔ وہ ہمیں مزے مزے کی کہانیاں سُنائے گی۔"

عائشہ پھر بھی نہ مانی اور بہنوں کا راستہ روک کر بولی۔ "نہ نہ۔ میں نہیں کھولنے دوں گی۔"

لیکن بہنوں نے اُس کی کوئی پروانہ کی اور دو تین تھپّڑ جڑ کر اُسے پرے ہٹا دیا۔ پھر دروازے کو چوپٹ کھول دیا۔

"خالہ جان، تشریف لایئے۔"

مگر راستے میں زنادہ کھڑا تھا اور غُصّے کے مارے زور زور سے بھونک رہا تھا۔ چُڑیل اُس کے ڈر سے آگے نہ بڑھی اور وہیں کھڑے ہاتھ پھیلا کر بولی:

"پھُوپھُو۔ بیٹی، اِس کتّے کی بد بُو سے تو دماغ اُڑا جاتا ہے، جب تک اس کو جان سے نہیں مار دو گی، میں اندر نہیں آؤں گی۔"

بڑی بہنوں نے اُسی وقت کُتّے کر پکڑا اور گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔ عائشہ بے چاری بہت روئی، بُہت چلّائی، بہترا منع کیا مگر بہنوں نے ایک نہ سُنی۔ وہ چھ ایک طرف اور عائشہ اکیلی ایک طرف۔ وہ غریب کیا کر سکتی تھی۔ عائشہ کو کُتّے کے پاس روتا ہُوا چھوڑ کر باقی بہنوں نے بُڑھیا کو اندر بُلا لیا۔

جُوں ہی چُڑیل نے دروازے کے اندر پاؤں رکھا، مُردہ کُتّے کی لاش بھُونکنے لگی۔ بُڑھیا پھر پیچھے ہٹ گئی۔

”توبہ !توبہ !مرے ہُوئے کُتّے میں سے تو اور بُری بُو آ رہی ہے۔ میں تو اندر نہیں آؤں گی۔ پہلے اس کو جلا دو۔“

بڑی بہنوں نے فوراً کُتّے کی لاش کو جلا دیا۔ عائشہ اُنہیں نہ روک سکی۔ لیکن جب آگ اچھّی طرح بُجھ گئی تو اُس نے کُتّے کی راکھ سمیٹ کر رومال میں باندھی اور اپنے پاس رکھ لی۔ پھر الگ بیٹھ کر اپنے پیارے کُتّے کو یاد کر کے رونے لگی۔ بہنوں نے بُڑھیا کے لیے اچھے اچھے کھانے تیّار کیے اور اس سے مزے مزے کی باتیں سُنتی رہیں۔

دن کے وقت تو بُڑھیا لڑکیوں کے ساتھ ہنستی بولتی رہی، جیسے سچ مُچ کی خالہ ہو۔ اُس نے لڑکیوں کو تحفے بھی دیے۔ لیکن جب رات ہوئی تو وہ اپنی اصلی شکل میں آ گئی۔ اُس کی آنکھیں انگاروں کی طرح چمکنے لگیں۔ چھُروں کی طرح تیز اور لمبے دانت نِکل آئے۔ بال سانپوں کی مانند پھُنکارنے لگے۔ ہاتھ تیز ناخنوں والے پنجے بن گئے۔ وہ بے چین ہو کر اِدھر اُدھر گھُومنے لگی اور چیخنے چلّانے لگی:

”اس گھر میں سات بہنیں ہیں۔ میں آج ان سب کو کھا جاؤں گی۔“

عائشہ کو بُڑھیا پر پہلے ہی شک تھا۔ وہ جلدی سے چارپائی کے نیچے چھُپ گئی۔ باقی چھ بہنوں کو خبر ہی نہ ہوئی۔ چڑیل نے اُن سب کو پکڑ لیا۔ سب سے پہلے اُس نے بڑی بہن سے پُوچھا:

"میرے نرم نرم چُوزے، بول تُجھے کہاں سے کھانا شروع کروں؟"

"میرے سر سے کھانا شروع کرو کیوں کہ اس احمق نے عائشہ کی بات نہ سمجھی۔" بڑی بہن نے جواب دیا۔

بُڑھیا نے مزے لے لے کر بڑی بہن کو کھایا۔ پھر اُس سے چھوٹی کے پاس گئی اور بولی:

"میرے نرم نرم چُوزے، بول تُجھے کہاں سے کھانا شروع کروں؟"

"پہلے میرے احمق ہاتھوں کو کھاؤ کیوں کہ ان سے میں نے عائشہ کو مارا تھا۔" دوسری بہن نے جواب دیا۔

چُڑیل اُس کے ہاتھوں کی ہڈّیاں چبانے لگی۔ جب ساری لڑکی اُس کے پیٹ میں

چلی گئی اور اُس نے تیسری لڑکی سے وہی سوال کیا۔ لڑکی نے جواب دیا:

"پہلے میرے کان کھاؤ کیوں کہ اُنہوں نے عائشہ کی ایک نہ سُنی۔"

چُڑیل نے تیسری بہن کو بھی نِگل لیا۔ جب اُس نے چوتھی بہن سے پُوچھا تو اُس نے کہا:

"پہلے میری ٹانگیں کھاؤ کیوں کہ اِن بے وقوفوں نے عائشہ کو مارا تھا۔"

چُڑیل نے اُسے بھی ہڑپ کر لیا۔ پانچویں بہن نے کہا:

"پہلے میرا مُنہ کھاؤ۔ جب عائشہ مجھے دروازہ کھولنے سے روک رہی تھی تو یہ اُسے بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔"

چُڑیل نے اُسے بھی چٹ کر لیا۔ اب اُس نے چھٹی بہن سے پُوچھا تو وہ بولی:

"پہلے میری آنکھیں کھاؤ۔ اِنہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ عائشہ دروازہ کھولنے سے کیوں منع کر رہی ہے۔" چُڑیل اُس کو بھی ٹرپ کر گئی۔

اب وہ ساتویں بہن کی تلاش میں کونے کھُدرے دیکھنے لگی۔ ہر کمرے میں گئی۔

صحن میں ڈھونڈا۔ آخر اُس کو معلُوم ہو گیا کہ عائشہ چارپائی کے نیچے چھُپی ہوئی ہے۔ وہ کڑک کر بولی:

"مُجھ سے بچ کر کہاں جائے گی۔ بول، پہلے کہاں سے کھاؤں؟"

عائشہ مُنہ سے ایک لفظ نہ بولی۔ اُس نے چُپکے سے وہ پوٹلی نکالی جس میں زنادہ کی راکھ بندھی ہوئی تھی۔ اُس نے پوٹلی چڑیل کے مُنہ پر دے ماری۔ ایسا لگتا تھا جیسے راکھ کا ہر ذرّہ زنادہ بن گیا ہے اور بھونک بھونک کر کہہ رہا ہے:

"بھوں، بھوں۔۔۔ میں زنادہ ہوں۔ ان لڑکیوں کا رکھوالا۔ جو کوئی اِنہیں نقصان پہنچائے گا میں اُس کی بوٹیاں نوچ لُوں گا۔"

چُڑیل ڈر کے مارے دروازے کی طرف بھاگی۔ وہ چیخ رہی تھی:

"مجھے جانے دو۔ مجھے جانے دو۔ یہ کُتّا مُجھے مار ڈالے گا۔"

لیکن کُتّے کی راکھ بھونکے جا رہی تھی:

"میں زنادہ ہوں۔ میں زنادہ ہوں۔" ان آوازوں نے چُڑیل کے جسم میں آگ لگا

دی اور وہ تڑپ تڑپ کر مر گئی۔ عائشہ چارپائی کے نیچے سے نِکل آئی اور گھر کا دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔ پھر یہ تالا اُس دن کھولا جب اُس کے ابّا حج سے واپس آئے۔

سمندر کی بیٹیاں

شمالی افریقہ کے ساحلوں پر جتنے شہر آباد ہیں، ان میں الجزائر کا دارالحکومت الجزیرہ سب سے زیادہ خُوب صُورت ہے۔ اس کی عمارتیں بحیرۂ روم کے پانیوں سے اُٹھ کر پہاڑیوں کی سر سبز چٹّانوں تک چلی گئی ہیں۔ عرب اس شہر کو انگوٹھی میں جڑا ہوا نگینہ کہتے ہیں۔ شہر کی تنگ گلیاں گھُوم کر قلعے تک پہنچ جاتی ہیں اور قلعہ ایسے لگتا ہے جیسے پہاڑی نے سر پر تاج پہن رکھا ہو۔

اس شہر کے بارونق بازاروں میں سوداگر اور کاریگر اپنا اپنا مال فروخت کرتے نظر آتے ہیں۔ سونے اور چاندی کے زیورات، سونے چاندی کے تاروں سے بنے ہوئے کپڑے، طرح طرح کے برتن، سجاوٹ کا سامان، غرض کون سی چیز ہے جو یہاں نہیں۔

یہ نہایت خوش حال شہر ہے۔ سوداگر صدیوں سے یہاں کاروبار کر رہے ہیں اور

بڑے امیر ہیں۔ لیکن الجزائر کے لوگ آج بھی ایک سوداگر کا ذکر کرتے ہیں جو ان سب سے زیادہ امیر تھا۔ کہتے ہیں وہ جس چیز کو چھُولیتا، وہ سونا ہو جاتی۔ جب وہ فوت ہوا تو اپنے پیچھے بے شمار دولت چھوڑ گیا۔ یہ دولت کتنی تھی اور کہاں کہاں تھی؟ اس کا اندازہ اُسے بھی نہ تھا۔

یہ ساری دولت وہ اپنے اکلوتے بیٹے عبد اللہ کے نام کر گیا تھا۔ عبد اللہ بے حد خُوب صُورت اور ذہین نوجوان تھا۔ دل کا بے حد سخی تھا اور یہی سخاوت اُسے برباد کر گئی۔ وہ کسی کو مایوس نہ کرتا تھا۔ ہر ایک کی ضُرورت پوری کرتا تھا۔ دوستوں کی خوب خاطر مدارات کرتا۔ اُنھیں خوب کھلاتا پلاتا، غیروں کے ساتھ بھی اُس کا یہی سُلُوک تھا۔ اُس کے گھر کے دروازے سب کے لیے کھُلے تھے۔ اُس کے دستر خوان پر ایک ایک وقت میں سو سو مہمان کھانا کھاتے تھے۔

ایسی شاہ خرچی کے سبب سال کے اندر اندر سارا روپیہ خرچ ہو گیا اور عبد اللہ بالکل پھانک ہو کر رہ گیا۔ باپ کی طرح کاروبار کرنے کا سلیقہ نہیں تھا۔ اب اُسے الجزائر میں رہتے ہوئے بھی شرم آتی تھی۔ لوگ کیا کہیں گئے کہ ایسا امیر آدی

اتنا غریب ہو گیا! یہ سوچ کر عبد اللہ نے اپنے باپ دادا والا گھر بیچ دیا اور اُس پیسے سے اپنے قرض ادا کیے۔ پھر گھوڑے پر سوار ہو کر بُحیرۂ روم کے ساحل پر چلتا ہوا دُور نِکل گیا۔ وہ کہاں جا رہا ہے، اُسے کچھ خبر نہ تھی۔

سب سے پہلے اس کے راستے میں گھنا جنگل آیا۔ اتنا گھنا کہ اُس میں دن کے وقت بھی اندھیرا تھا۔ عبد اللہ اس جنگل میں بڑی احتیاط کے ساتھ چلتا رہا۔ ہاتھ تلوار کے دستے پر تھا اور آنکھیں تیزی سے اِرد گرد کا جائزہ لے رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ جنگل کے درمیان میں پہنچا۔ اسے یہاں تھوڑی سی صاف ستھری اور کھلی جگہ نظر آئی۔ یہاں پہنچ کر عبد اللہ کے پاؤں جیسے پتھر کے ہو گئے۔ کیوں کہ سامنے نظارہ ہی ایسا خوف ناک تھا کہ جسے دیکھ کر بہادر سے بہادر آدمی کا خون رگوں میں جم کر رہ جائے۔ ایک درخت کی ٹہنی پر ایک لڑکی اُلٹی لٹک رہی تھی۔ پاؤں میں رسّا باندھ کے اُسے درخت کے ساتھ لٹکا دیا گیا تھا اور وہ شاید مر چُکی تھی۔

یہ دیکھ کر عبد اللہ گھوڑے سے اُترا اور ہولے ہولے درخت کے پاس گیا۔ اُس

نے دیکھا کہ لڑکی بہت خوب صُورت ہے۔ اُس نے یہ بھی دیکھا کہ لڑکی کی گردن زخمی ہے جس میں سے خون بہتا رہتا ہے۔ لڑکی کے سر کے نیچے ایک بڑا سا پیالہ پڑا تھا جو شاید اس لیے رکھا گیا تھا کہ خُون اس میں گرتا رہے۔ اس پیالے میں تین سُرخ بوندیں پڑی تھیں۔ عبد اللہ نے اور نزدیک جا کر دیکھا۔ یہ خُون کی بوندیں نہیں تھیں۔ تین لعل تھے جو اپنی سُرخی اور خُوب صُورتی میں بے مثال تھے۔

عبد اللہ نے لڑکی کو چھُو کر معلُوم کرنا چاہا کہ وہ زندہ ہے یا مردہ، لیکن اس کا ہاتھ کسی غیبی طاقت نے روک لیا۔ یوں لگتا تھا کہ لڑکی کے گرد کوئی طِلسمی دیوار ہے۔ پھر اُس نے جھک کر پیالے میں رکھے ہوئے تین لعلوں میں سے ایک اُٹھایا اور اپنی پگڑی میں چھُپا کر رکھ لیا۔ اس نے دل میں سوچا، میں لعل اپنے پاس رکھوں گا تا کہ یہ ثبوت رہے کہ میں نے خواب نہیں دیکھا بلکہ سچ مچ جنگل میں گیا تھا۔ وہاں ایک لڑکی درخت کے ساتھ اُلٹی لٹک رہی تھی اور اُس کی گردن سے نکلنے والے خُون کی بوندیں جم کر لعل بن گئی تھیں۔ پھر وہ گھوڑے پر سوار ہُوا اور اپنا

سفر جاری رکھا۔

چلتے چلتے وہ ایک شہر میں پہنچا۔ یہ کس مُلک کا شہر تھا؟ اسے کچھ پتا نہ تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ میں اس شہر میں رہ کر قسمت آزماؤں گا۔ یہیں کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کروں گا۔ اس کے پاس جتنا تھوڑا بُہت روپیہ تھا اُس سے تجارت شروع کر دی اور ایک مکان کرائے پر لے کر رہنے لگا۔

اس ملک کے بادشاہ کی ایک ہی بیٹی تھی۔ بڑی حسین، پڑھی لکھی اور ذہین۔ خاص طور پر وہ جادُو کے عِلم میں بہت ماہر تھی۔ بادشاہ کے وزیر کا ایک بیٹا تھا۔ بادشاہ نے وزیر سے وعدہ کیا تھا کہ وہ شہزادی کی شادی وزیر زادے سے کرے گا۔ لیکن شرط یہ تھی کہ لڑکی بھی اس رشتے کو پسند کرے۔ لڑکی بیاہنے کے قابل ہو چُکی تھی، اس لیے ایک دِن بادشاہ نے بیٹی سے کہا:

”وزیر نے اپنے لڑکے کے لیے تُمہارا رشتہ مانگا ہے۔ لڑکا مُجھے پسند ہے، لیکن تُمہاری رضامندی بھی ضروری ہے۔“

شہزادی نے جواب دیا۔ ”ابّا حضور، چاہے وزیر کا بیٹا ہو یا کوئی اور، میں تو اُس سے

شادی کروں گی جو میری شرطیں پوری کرے۔"

"وہ شرطیں کیا ہیں؟" باپ نے پوچھا۔ "پہلی شرط یہ ہے کہ وہ مرد جو مُجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے میرے لیے تین لعل لے کر آئے۔" لڑکی نے جواب دیا۔

بادشاہ یہ سُن کر زور سے ہنسا اور بولا:

"بیٹی، میرا خیال ہے تُم یہ بات سنجیدگی سے نہیں کہہ رہی ہو۔ تم جانتی ہو کہ ہمارے ملک میں لعل نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔"

"ابّا حضور، میں سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں۔ میں اُسی سے شادی کروں گی جو مُجھے تین لعل لا کر دے گا۔ "

وزیر نے جب سُنا تو بادشاہ سے کہا:

"حضور ملک میں منادی کرا دینی چاہیے۔ شاید کوئی شخص ایسا مل جائے جس کے پاس تین لعل ہوں۔ وہ لعل لے کر آئے تو اُسے اُن کی قیمت دے دی جائے اور شہزادی سے کہہ دیا جائے کہ یہ لعل وزیر زادہ لے کر آیا ہے۔"

مُلک کے ہر شہر، ہر گاؤں میں ڈھنڈورا پٹوا دیا گیا۔ عبد اللہ نے یہ اعلان سُنا تو اُسے اُس لعل کا خیال آیا جو اُسے جنگل سے ملا تھا۔ اُس نے لعل لیا اور بادشاہ کے دربار میں جا کر کہا: ”حضور، میرے پاس ایک لعل ہے اور یہ اتنا قیمتی اور خوب صُورت ہے کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔“

بادشاہ نے یہ سوچ کر لعل لے لیا کہ تین نہیں ملتے تو چلو ایک ہی سہی۔ وہ لعل لے کر بیٹی کے پاس گیا تو اُس نے لعل دیکھ کر کہا:

”ابّا حضور، یہ تو ایک ہے۔ میری شرط تین کی ہے۔“

باپ نے بیٹی کو بہت سمجھایا بجھایا لیکن وہ ایک لعل لے کر راضی نہ ہوئی۔ اگلے روز بادشاہ نے عبد اللہ کو دربار میں بُلایا اور کہا:

”مجھے ایسے ہی دو لعل اور چاہئیں۔ یہ کام تُمہارے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ مُنہ مانگا انعام دوں گا، ورنہ سر تَن سے جُدا کر دیا جائے گا۔“

”بہت اچھا، حضور۔“ عبد اللہ نے جواب دیا۔

"واپس آکر اُس نے دُکان میں تالا لگایا، گھوڑے پر سوار ہوا۔ اور دوبارہ اُسی جنگل میں پہنچا۔ سُورج غروب ہو چُکا تھا۔ لڑکی اب بھی پہلے کی طرح درخت سے اُلٹی لٹک رہی تھی۔ وہ لڑکی کے قریب گیا ہی تھا کہ ایک دم بجلی سی چمکی، پھر زور کا دھماکا ہوا۔ پلک جھپکتے میں اُس کے سامنے ایک نہایت بد شکل آدمی کھڑا تھا، جس نے سر سے پاؤں تک سیاہ چغہ پہن رکھا تھا۔ خوش قسمتی سے اُس کی نظر عبد اللہ پر نہیں پڑی۔ عبد اللہ جلدی سے ایک درخت کے پیچھے چھُپ گیا تھا۔

یہ کالا کلوٹا آدمی جادُوگر تھا۔ اُس نے لڑکی کو درخت سے اُتار کر زمین پر لٹا دیا۔ پھر اُس کی گردن کے زخم پر منتر پھُونک کر ہاتھ ہلائے۔ لڑکی کو ہوش آگیا اور وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اب اُس کے زرد چہرے پر سُرخی آگئی تھی۔ عبد اللہ نے دیکھا کہ وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین نظر آرہی ہے۔

جادُوگر نے چھُری نکالی اور لڑکی کو مارنے لگا۔ "بولو مُجھ سے شادی کرو گی؟"

"نہیں، کبھی نہیں۔۔۔ بے شک تم میری گردن ہزار بار کاٹ دو۔ میں تُم سے شادی نہیں کروں گی۔" لڑکی نے چیخ کر جواب دیا۔ جادُوگر نے چھُری گھُما کر

لڑکی کے ماری اور دوبارہ پُوچھا:

”مانو گی۔۔۔؟“

جادُوگر دُوسری چھڑی مارنے والا تھا کہ عبد اللہ درخت کی اوٹ سے نکلا اور تلوار کے ایک ہی وار سے جادُوگر کا سر اُڑا دیا۔ لڑکی حیران رہ گئی۔ اُس پر ظلم کرنے والے کا یہ حشر ہو گا، اُسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ پھر وہ آگے بڑھ کر عبد اللہ کے قدموں میں گر گئی اور وہ رو رو کر کہنے لگی:

”آپ نے مجھے اِس ظالم سے بچایا۔ میں عُمر بھر آپ کی غلام رہوں گی۔“

پھر اُس نے اپنی کہانی سُنائی:

”میرا نام رُوبی ہے۔ میں سمندر کے بادشاہ کی بیٹی ہوں۔ ایک برس پہلے میں اپنے محل کے باغ میں بیٹھی تھی کہ سمندر میں زور کا طوفان آ گیا اور ہوا کا ایک تیز جھونکا مُجھے اُٹھا کر اِس جنگل میں پھینک گیا۔ یہاں یہ جادُوگر بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی رُعب سے بولا:

زندہ رہنا چاہتی ہو تو مُجھ سے شادی کر لو۔

میں نے انکار کیا تو اس نے مُجھ کو خوب پیٹا اور میرے پاؤں میں رسّا باندھ کر درخت سے اُلٹا لٹکا دیا۔ پھر میری گردن خنجر سے زخمی کر کے سر کے نیچے پیالہ رکھ دیا تا کہ خون کا جو قطرہ بھی گرے اس میں جمع ہو تا جائے۔ میرے خون کا ہر قطرہ لعل بن جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ ہر رات میرے پاس آتا، مُجھے درخت سے اُتار کر زندہ کرتا اور چھڑی سے خوب مارتا۔ لیکن اب میں آزاد ہوں۔ آپ کی باندی ہُوں۔"

لڑکی نے اپنی کہانی ختم کی تو عبد اللہ نے کہا:

"ہم سب اللہ کے بندے ہیں۔ کوئی کسی کا غلام نہیں۔ کیا تُم مُجھ سے شادی کرو گی؟"

لڑکی نے شرما کر سر جھکا دیا اور پھر بولی۔ "جب تک میرہ پاس دُلہنوں والا جوڑا نہیں ہو گا، میری شادی نہیں ہو گی۔ ڈولی اُٹھانے والے کہار بھی ہونے چاہیں۔ اس لیے آپ مُجھے سمندر کے ساحل تک لے جائیں۔"

عبد اللہ نے لڑکی کو گھوڑے پر بٹھایا اور سمندر کی طرف چل دیا۔ رات ختم ہونے والی تھی۔ سورج کی روشنی ہولے ہولے پھیلنے لگی تھی۔

"یہاں رُک جایئے۔" لڑکی گھوڑے سے اُترتے ہوئے بولی۔ "زیادہ دیر نہیں لگاؤں گی۔ جلد ہی واپس آجاؤں گی۔"

یہ کہہ کر لڑکی سمندر میں کُود گئی اور آن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

عبد اللہ نے چند گھنٹے اِنتظار کیا۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے برسوں سے یہاں کھڑا ہے۔ وہ برابر پانی کر گھُور رہا تھا۔ حتیٰ کہ اس کی آنکھیں دُکھنے لگیں۔ سمندر کی ہر لہر اُسے لڑکی کے واپس آنے کی اُمّید دلاتی تھی مگر گہرے نیلے پانی پر سُورج کی چمک کے سوا کُچھ نظر نہ آتا تھا۔

آخر کار بُہت دُور، سطحِ سمندر پر اُسے ایک دھبّا سا دکھائی دیا۔ ہولے ہولے یہ دھبّا بڑا ہونے لگا۔ پھر ایسا لگا جیسے ایک چھوٹا سا جُلُوس سمندر میں سے نِکل کر اُس کی طرف آ رہا ہے۔

جب یہ جلُوس ساحل پر اُترا تو عبد اللہ نے دیکھا کہ رُوبی لال رنگ کا جوڑا پہنے ڈولی میں بیٹھی ہے۔
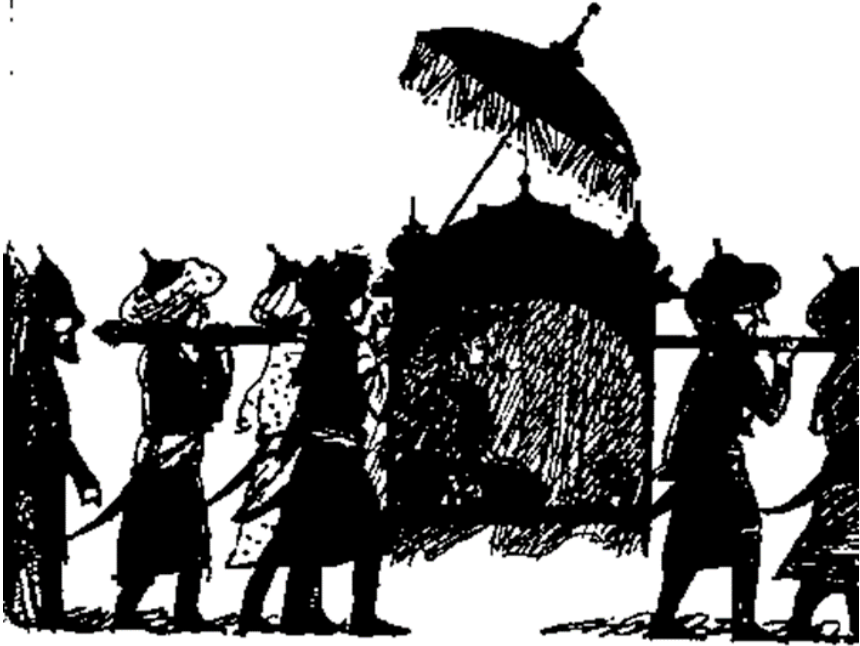
ڈولی کے پردے اُٹھے ہوئے تھے اور اُس کو آٹھ کہاروں نے اُٹھا رکھا تھا۔ اتنے ہی آدمی تلواریں ہاتھوں میں لیے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ برات کے آگے ایک لمبا تڑنگا مرد سر پر تاج رکھے، کمر میں تلوار لگائے، کالے گھوڑے پر سوار

تھا۔ اُس آدمی نے عبداللہ کے پاس آکر کہا:

"شہزادے، سمندر کے بادشاہ نے آپ کو سلام کہا ہے۔ خُدا کی مدد اور اپنی بہادری سے آپ نے وہ کام کر دکھایا جو آج تک بڑے بڑے بہادروں سے نہ ہو سکا۔ آپ ظالم جادُوگر سے ہماری شہزادی کو چھُڑا لائے۔ بادشاہ نے انعام کے طور پر شہزادی آپ ہی کو بخش دی۔ خُدا آپ کو شاد و آباد رکھے۔ آمین"!

اتنا کہہ کر وہ شخص غائب ہو گیا۔ سمندر کی لہروں میں اُس کا نشان تک نظر نہ آیا۔ عبداللہ رُوبی کے ساتھ ڈولی میں بیٹھ گیا اور اُس کو لے کر سیدھا اپنے گھر پہنچا۔ دونوں کی بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ میاں بیوی بے حد خوش تھے۔

اُدھر بادشاہ لعلوں کا اِنتظار کر رہا تھا۔ جب اُس نے سُنا کہ عبداللہ شہر میں واپس آ چکا ہے اور اُس نے شادی رچالی ہے تو اُس کو بے حد غصّہ آیا۔ اُس نے فوراً عبداللہ کو طلب کیا اور پُوچھا:

"باقی دو لعل کہاں ہیں؟"

”بادشاہ سلامت“ عبد اللہ نے کہا۔ ”میری شادی ہو گئی ہے۔ اس جھنجھٹ میں ایسا پھنسا کہ لعل لانا بھُول گیا۔ مہربانی فرما کر ایک مہینے کی مہلت دیجیے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایک مہینے کے اندر اندر لعل آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔“

بادشاہ نے کہا ”ایک ماہ کے بعد یا تو میں لعل لُوں گا یا تُمہارا سر۔“

عبد اللہ گھر واپس آیا تو خیالوں میں گُم تھا۔ سوچ رہا تھا کہ اب تو رُوبی جادُو گر کے چُنگل سے نِکل کر اُس کے پاس آ گئی ہے، لعل کہاں سے آئیں گے۔ رُوبی نے شوہر کو پریشان دیکھا تو سمجھ گئی کہ کوئی نہ کوئی بات ضُرور ہے۔ اُس نے پُوچھا:

”بادشاہ نے آپ سے کیا کہا جو آپ اس قدر اُداس ہیں؟“

”اُس نے کہا ہے کہ اگر ایک ماہ کے اندر اندر میں دو لعل نہ لا سکا تو میرا سر تن سے جُدا کر دیا جائے گا۔“ عبد اللہ نے بتایا۔ ”لو۔ اِس سے آسان کام تو کوئی ہے ہی نہیں۔ آپ خواہ مخواہ پریشان ہیں۔“ رُوبی نے ہنس کر کہا۔ ”آپ جب حکم کریں، لعل حاضر کر دیے جائیں گے۔“

یہ کہہ کر رُوبی دوڑ کر چاقو لائی اور اُس کی نوک اپنے بائیں بازو میں چبھو دی۔ زخم میں سے خُون کے دو بڑے بڑے قطرے ٹپکے اور زمین پر گِرتے ہی لعل بن گئے۔ عبد اللہ نے لعل اُٹھا لیے، رب کا شکریہ ادا کیا اور سیدھا بادشاہ کے پاس پہنچا۔

بادشاہ نے عبد اللہ کے ہاتھ میں لعل دیکھے تو خوش ہو کر بولا۔ ''کہو، کیا انعام دوں؟"

''کُچھ نہیں۔ حضُور۔" عبد اللہ نے سر جھکا کر جواب دیا۔ ''یہ شہزادی صاحبہ کے لیے میری طرف سے تُحفہ ہے۔"

بادشاہ نے بیٹی کو لعل دے کر کہا۔ ''اب بتاؤ، وزیر کے بیٹے سے شادی منظور ہے؟"

شہزادی نے جواب دیا۔ ''ابّا حضور، یہ تو میری پہلی شرط تھی۔ دوسری شرط یہ ہے کہ جو شخص میرے ہار کے لیے دُودھیا رنگ کے بڑے بڑے موتی لائے گا، میں اُسی سے شادی کروں گی۔"

”میری بچّی ایسے موتی تو ملک بھر میں نہیں۔ تُم کیسی نا مُمکن چیز مانگتی ہو؟“

”یہ میں بھی جانتی ہوں کہ ایسے موتی ہمارے مُلک میں نہیں ہیں۔ لیکن جو شخص تین لعل لایا ہے، وہی میرے ہار کے لیے یہ موتی بھی لا سکتا ہے۔“

اگلے روز بادشاہ نے پھر عبد اللہ سوداگر کو بُلا بھیجا اور جب وہ آیا تو اُس سے کہا:

”مجھے دودھیا رنگ کے سچّے موتی چاہئیں، تاکہ میری بیٹی اُن کا ہار بنا سکے۔ میں تُمھیں مُنہ مانگا اِنعام دوں گا، ورنہ سر قلم کروں گا۔“

”لے آؤں گا، حضور۔“ بے چارے عبد اللہ نے سر جھکا کر کہا۔

گھر پہنچتے ہی عبد اللہ نے یہ کہانی رُوبی کو کہہ سُنائی اور کہا، ”موتی اتنے ہوں کہ شہزادی کا ہار بن سکے۔“

”ٹھیک ہے۔“ رُوبی نے کہا۔ ”بادشاہ کو موتی بھی مل جائیں گے۔“

یہ کہہ کر اُس نے جلدی جلدی ایک چِٹھّی لکھی۔ پھر اُسے بند کر کے اُس پر اپنی انگوٹھی کی مُہر لگائی اور عبد اللہ کے حوالے کرتے ہوئے کہا:

''سمندر کے ساحل پر اُس جگہ لے جایئے جہاں سے میں نِکلی تھی۔ وہاں کھڑے ہو کر تین بار پُکارنا۔ 'اے سُمندر کے بادشاد! اے سُمندر کے بادشاہ! اے سُمندر کے بادشاہ!' تین بار کہہ چُکو گے تو ایک ایلچی آئے گا۔ اُس کو یہ چِٹھّی دے دینا۔ ڈرنا ہرگز نہیں، خواہ وہ کیسا ہی ہو۔ ایلچی چِٹھّی لے کر چلا جائے تو وہیں انتظار کرتے رہنا خواہ ایک دن لگے، دو دن لگیں یا تین دن۔ اُس کی واپسی تک وہیں کھڑے رہنا۔''

عبد اللہ نے چِٹھّی لی اور گھوڑے پر سوار ہو کر سیدھا سُمندر کے ساحل پر پہنچا۔ پھر اُس نے تین بار بُلند آواز سے پُکارا۔ ''اے سُمندر کے بادشاہ!'' آخری لفظ اُس کے مُنہ میں تھا کہ پانی کی سطح پر ایک سیاہ جِن نمُودار ہوا۔ وہ عام آدمی سے دس گنا بڑا تھا۔ عبد اللہ نے چِٹھّی اُس کی طرف بڑھا دی۔ وہ چِٹھّی لے کر غائب ہو گیا۔

عبد اللہ نے تین دن اور تین راتیں سُمندر کے کنارے گزاریں۔ آخر چوتھے روز صُبح کو سُمندر کی سطح پر پہلے کی طرح ایک جُلُوس نظر آیا۔ قریب آنے پر پتا چلا کہ

کہار ایک ڈولی اُٹھائے چلے آ رہے ہیں۔ ڈولی میں ایک خوب صُورت لڑکی بیٹھی ہے جو رُوبی جیسی سُرخ و سپید نہیں بلکہ موتیوں جیسی دُودھیا ہے۔ برات کے آگے آگے وہی گھڑ سوار تھا جو رُوبی کے ساتھ آیا تھا۔ گھُڑسوار نے عبد اللہ کو سلام کر کے کہا:

"شہزادے، سُمندر کے بادشاہ نے آپ کو سلام کہا ہے۔ ڈولی میں موتی ہے، سمندر کے بادشاہ کے وزیر کی بیٹی۔ اُس نے یہ بھی تُمھیں بخشی۔"

اُس نے یہ کہا اور گھوڑے سمیت پانی میں چھلانگ لگا کر غائب ہو گیا۔ عبد اللہ موتی کے ساتھ ڈولی میں بیٹھ کر گھر گیا۔ رُوبی نے دونوں کا شان دار اِستقبال کیا۔ دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ سات دن، سات راتیں دعوتیں ہوتی رہیں۔ سب خوش تھے۔

تین ہفتے اِسی طرح گُزر گئے۔ ایک دن عبد اللہ نے رُوبی سے کہا:

"بیگم، کل مُجھے بادشاہ کی خدمت میں موتی پیش کرنا ہیں۔ بولو، کیا کروں؟"

رُوبی نے اُسی وقت موتی کو کمرے میں بُلایا اور بُرا بھلا کہنے لگی۔ موتی اور عبد اللہ حیران تھے کہ رُوبی بِلا وجہ کیوں لڑ رہی ہے۔ اچانک رُوبی نے اُلٹے ہاتھ کا ایک تھپڑ موتی کے گال پر دے مارا۔ موتی رونے لگی۔ اُس کے خوب صُورت گالوں پر بڑے بڑے آنسو ڈھلکنے لگے۔ رُوبی ان آنسوؤں کو سونے کے پیالے میں جمع کرتی گئی۔ پھر اُس نے موتی کو گلے لگا کر خوب پیار کیا۔ سونے کا پیالہ دُودھیا رنگ کے بڑے بڑے موتیوں سے بھر چُکا تھا۔

دوسرے دن عبد اللہ موتی لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ بہت خوش ہُوا۔ شہزادی بھی خُوش تھی۔ لیکن اب اُس نے باپ کے سامنے تیسری شرط رکھ دی۔ اُس نے کہا:

"ابّا جان، میری دو شرطیں تو پوری ہو گئیں۔ تیسری شرط یہ ہے کہ میرے لیے کستُوری (مُشک) سے بھری ہوئی ایک ڈبیا لائی جائے۔"

"بیٹی، کیا یہ تُمہاری آخری فرمائش ہے؟" بادشاہ نے پُوچھا۔

"ہاں، ابّا جان۔ یہ میری آخری فرمائش ہے۔"

بادشاہ نے ایک بار پھر عبد اللہ کو طلب کیا اور کہا:

"ابھی ایک چیز باقی ہے اور وہ ہے کستُوری بھری ڈبیا۔ یہ ڈبیا ایک ماہ کے اندر اندر پیش کرو، ورنہ سر تن سے جُدا کر دیا جائے گا۔" عبد اللہ نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر جھکایا اور سلام کر کے چلا آیا۔

گھر پہنچ کر اُس نے سارا قصّہ رُوبی کو سُنایا اور کہا:

"بیگم، اب کے بادشاہ نے کستُوری کی فرمائش کی ہے۔ تُمہاری مدد کے بغیر میں کُچھ نہیں کر سکتا۔ کستُوری کہاں سے ملے گی؟ مُجھے تو یہ بھی معلوم نہیں۔"

کستُوری بھی مل جائے گی۔" رُوبی نے جواب دیا اور پھر خط لکھنے بیٹھ گئی۔ لکھ چکی تو انگوٹھی سے مُہر لگا کر اُسے بند کیا اور عبد اللہ کے حوالے کر کے اُسے اُسی جگہ جانے کے لیے کہا جہاں وہ پہلے دو بار گیا تھا۔ اُس نے تاکید کی کہ وہاں پہنچ کر وہ تین بار سمندر کے بادشاہ کو پُکارے اور ایلچی کو خط دے کر جواب کا انتظار کرے۔

رُوبی نے جو کُچھ سمجھایا تھا، عبد اللہ نے ویسے ہی کیا۔ اُس نے پہلے کی طرح تین بار

آوازیں دیں تو وہی سیاہ فام جِن پانی کی سطح پر نمودار ہوا اور خط لے کر پانی میں غائب ہو گیا۔ عبد اللہ تین دن اور تین راتیں اِنتظار کرتا رہا۔ آخر چوتھے دن صُبح سویرے اُس کو پانی کی سطح پر وہی جلُوس نظر آیا۔ یہ جلُوس بھی اُس کی طرف چلا آرہا تھا۔ ڈولی میں ایک حسین لڑکی بیٹھی تھی۔ اُس کے بال سنہری تھے۔ چہرے کی رنگت سونے کی طرح دمک رہی تھی۔

وُہ مرد جو جلُوس کے آگے آگے کالے گھوڑے پر سوار تھا، عبد اللہ کے پاس آکر بولا:

''شہزادے، یہ کستُوری ہے، سمندر کے بادشاہ کے سپہ سالار کی بیٹی۔ یہ تُمھاری تیسری بیوی ہوگی۔''

عبد اللہ لڑکی کے ساتھ ڈولی میں بیٹھ گیا اور ڈولی سیدھی اُس کے گھر گئی۔ رُوبی اور موتی نے اُن کا پُر جُوش اِستقبال کیا۔ شادی کی تیّاریاں پہلے سے ہو چُکی تھیں۔ خُوب دھوم دھڑکے سے بیاہ ہُوا۔ کئی دن تک دعوتیں ہوتی رہیں۔

ایک دن عبد اللہ نے رُوبی سے کہا:

”بیگم، کستُوری کی خُوش بُو سے گھر بھر مہکار ہتا ہے۔ لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اس خُوش بُو سے ڈبیا کیسے بھری جاسکتی ہے۔ تُم جانتی ہو بادشاہ کو کستُوری پیش کرنے کا وقت آ پہنچا ہے۔“

رُوبی نے کہا۔ ”یہ بات آپ مُجھ پر چھوڑ دیں۔“

یہ کہہ کر اُس نے کستُوری کو بُلایا اور حمّام میں لے گئی۔ جیسے ہی کستُوری گرم حمام میں داخل ہوئی، اُس کے جسم سے پسینا نکلنے لگا۔ رُوبی نے یہ پسینا ڈبیا میں بھرنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ وہ لبالب بھر گئی۔

اگلے دن صُبح سویرے عبد اللہ ڈبیا لے کر بادشاہ کے سامنے حاضر ہوا۔ بادشاہ خوشی سے چیخ اُٹھا:

”مانگو کیا مانگتے ہو؟ اب میری بیٹی وزیر کے بیٹے سے شادی کرنے پر رضامند ہو جائے گی۔“

عبد اللہ نے کہا۔ ”مجھے کِسی اِنعام کی ضُرورت نہیں حضُور۔“

شہزادی کستوری لے کر بہت خُوش ہوئی لیکن اُس نے وزیر کے بیٹے سے شادی کرنے سے اِنکار کر دیا۔ بولی:

"ابّا جان۔ میں نے کہا تھا کہ میں اُس شخص سے شادی کروں گی جو میرے لیے تین لعل، سچّے موتی اور کستُوری سے بھری ہوئی ڈبیا لائے گا۔ آپ کے خیال میں یہ قیمتی اور نایاب چیزیں وزیر کا بیٹا لے کر آیا ہے؟"

"اِس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کوئی بھی لایا ہو۔ یہ تُحفے وزیر کے بیٹے نے تُمھیں دیے ہیں۔" باپ نے سمجھایا۔

"نہیں۔ یہ تُحفے عبد اللہ نے مُجھے دیے ہیں اور میں اُسی سے شادی کروں گی۔ اور کسی سے نہیں۔"

"بیٹی، عبد اللہ کی پہلے ہی تین بیویاں ہیں۔ تُم سمجھتی کیوں نہیں؟"

"میں جانتی ہوں، ابّا جان۔ یہ تینوں بیویاں سمندر کی بیٹیاں ہیں۔" شہزادی تو سب کچھ جانتی تھی۔ اُس نے باپ کو بتایا "بڑی بیوی کا نام رُوبی ہے، منجھلی کا موتی

اور چھُوٹی کا کستُوری۔"

بادشاہ کو بیٹی کی خواہش کے سامنے جھُکنا پڑا۔ عبد اللہ سوداگر اور شہزادی کی شادی اُسی دن ہو گئی۔ مُلک بھر میں جشن منایا گیا۔ غریبوں اور محتاجوں کو کھانا کھلایا گیا۔

عبد اللہ سوداگر اپنی بیویوں کے ساتھ ہنسی خُوشی رہنے لگا۔ چاروں بیویاں بہنوں کی طرح رہتی تھیں اور ایک دوسری سے بالکل نہیں جلتی تھیں۔ عبد اللہ سب کے ساتھ، قُرآن کے حکم کے مطابق، ایک جیسا سُلوک کرتا تھا۔

شہزادی کا باپ جب بُہت بُوڑھا ہو گیا تو اُس نے اپنا تخت اور تاج عبد اللہ کو سونپ دیا اور اُس نے اس مُلک پر نہایت عقل مندی اور اِنصاف کے ساتھ سالہا سال حکومت کی۔

ایک مسخرہ

یورپ اور ایشیا کے بادشاہوں کی طرح شمالی افریقہ اور عرب کے بادشاہوں کے دربار میں بھی مسخرے ہوتے تھے تاکہ وہ بادشاہ اور اس کے درباریوں کا دل خوش کریں اور اُنہیں ہنسائیں۔ جب بادشاہ کا دل اداس ہوتا وہ مسخرے کو بُلا لیتا اور مسخرہ لطیفے اور کہانیاں سُنا کر اُس کا دل بہلاتا۔

درباری مسخرے کا کام بہت مُشکل اور خطرناک تھا۔ وہ بادشاہ کے خاص آدمیوں میں سے ہوتا تھا اور بادشاہ خوش ہو کر اُسے انعام دیتا تھا۔ لیکن اُس کے سر پر ہر وقت خطرے کی تلوار لٹکی ہوتی تھی۔ نہ معلوم کس وقت بادشاہ کو غصّہ آجائے اور وہ مسخرے کے قتل کا حکم دے دے۔

مسخرے کو بے وقوفوں والی حرکتیں کرنی پڑتی ہیں اور ہمیشہ بے وقوف بنے رہنا آسان کام نہیں۔ اچھا مسخرہ وہ ہوتا ہے کہ جیسے ہی بات کہنے کے لیے مُنہ

کھولے، لوگ ہنسنے لگیں۔ جوں ہی وہ کوئی حرکت کرے دیکھنے والوں میں ہنسی کی لہر دوڑ جائے۔ مسخرہ بننے کے لیے محنت اور دیانت دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض وقت مسخرے کی باتوں کا لوگ بُرا بھی مان جاتے ہیں اور اُس کے دُشمن بن جاتے ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے، مُلک تیونس کے کسی بادشاہ کے دربار میں ایک مسخرہ تھا۔ اس کا نام تھا بہلول۔ بادشاہ اُسے بُہت چاہتا تھا۔ اب اس کا حُلیہ سُنیے:

بڑی بڑی گول آنکھیں، بھونپو جیسے چوڑے چوڑے کان، مُنہ اتنا پھیلا ہُوا کہ ہنسے تو ایک کان سے دوسرے کان تک پھیل جائے، ٹھنگنا قد، رنگ کالا، چلتا تو ایسے لگتا جیسے لُڑھک رہا ہو۔ کبھی ناچنے لگتا۔ کبھی گٹھڑی سی بن کر لٹّو کی طرح گھُومتا ہُوا ایک طرف سے دوسری طرف نِکل جاتا۔

بہلول دیکھنے میں بے وقوف اور بُدّھو نظر آتا تھا مگر اُسے محل کی ایک ایک بات کا علم ہوتا تھا۔ دربار میں، باورچی خانے میں، یا زنان خانے میں جو کُچھ بھی ہوتا، وہ اُس سے نیا لطیفہ گھڑ لیتا۔ دربار کے لوگ بہلوں کے لطیفوں اور مذاق سے خوش

بھی ہوتے اور خوف بھی کھاتے۔

ایک رات بادشاہ کی تاج پوشی کا سالانہ جشن منایا گیا۔ دستر خوان پر قسم قسم کے کھانے چُنے گئے۔ مُرغِ مسلّم، بھُنے ہوئے چنے، سالم دُنبے اور کوسکوس۔ کوسکوس تیونس کے لوگوں کی پسندیدہ خوراک ہے۔ یہ میدے اور اُبلے ہُوئے گوشت کو ملا کر تیّار کی جاتی ہے۔ تیونسی اس کو بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔

جُوں جُوں رات بھیگ رہی تھی، جشن کی رونق بڑھ رہی تھی۔ لوگ بہلول کی باتوں سے خُوب لُطف اُٹھا رہے تھے۔ وہ اُنہیں لطیفے سُنا سُنا کر ہنسا رہا تھا۔ لیکن آج کچھ زیادہ ہی ترنگ میں تھا اور بلا سوچے سمجھے بکے جا رہا تھا۔ بادشاہ بھی اُس کے مذاق سے نہ بچ سکا۔ اُس نے سب کے سامنے بادشاہ پر آوازے کسنے شروع کر دیے اور بُلند آواز سے کہا:

"مُلک میں سب سے بڑا مسخرہ کون ہے؟ آپ لوگوں کا خیال ہو گا میں ہُوں۔ کیوں کہ میں بے ڈھنگے کپڑے پہنتا ہُوں۔ سر کے بل کھڑا ہو جاتا ہوں۔ یارو! میں دن رات محنت کرتا ہوں، پھر بھی اتنا بڑا مسخرہ نہیں بن سکا جتنا بڑا مسخرہ ہمارا

بادشاہ ہے۔" اس پر بادشاہ خوب ہنسا۔ بہلول بولتا گیا۔

"یہ ٹیڑھی ٹانگوں والا ہمارا بادشاہ ہے۔ ہی۔ ہی۔ آپ کو معلوم ہے، اس کی ٹانگیں ٹیڑھی کیوں ہیں؟ گھوڑے پر ہو یا پیدل، ٹانگیں ٹیڑھی ہی رہتی ہیں۔"

بادشاہ اب بھی ہنس رہا تھا۔

"دیکھو تو سہی، یہ آدھی عقل کا مالک، کنجوس مکھّی چُوس، ٹیڑھی ٹانگوں والا گنجا شخص ہمارا بادشاہ ہے۔"

"بکواس بند کرو۔" بادشاہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور گرج کر بولا۔ "تُم حد سے گُزر رہے ہو۔ میں نے تُمہارے مذاق کو بُہت برداشت کیا مگر اب حد ہو گئی۔ میں کیا، کوئی بھی اس کو برداشت نہیں کرے گا۔ قسم خُدا کی تُم کل ہی شیر کے آگے ڈال دیے جاؤ گے۔"

بادشاہ کا غصّہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ وہ ایسی دھمکیاں پہلے بھی دے چُکا تھا۔ ایک دن بہلول کو بُرا بھلا کہتا، دُوسرے دِن اُس کی کسی حرکت پر ہنس کر معاف کر

دیتا۔ لیکن آج اُس کا پارہ کچھ زیادہ ہی چڑھا ہوا تھا۔ اُس نے کہا:

”مت سمجھنا کہ میں پہلے کی طرح معاف کر دوں گا۔ ہر گز نہیں۔ خُدا گواہ ہے، میں اس وقت تک بستر پر نہیں سوؤں گا جب تک تُمہیں شیر کے آگے نہ ڈلوا دوں۔“

بہلول کی سِٹّی گُم ہو گئی۔ کیوں کہ قسم کھانے کے بعد معمولی آدمی بھی اپنے الفاظ سے نہیں پھر سکتا۔ بادشا تو پھر بادشاہ ہے۔ بہلول کو اپنی موت کا یقین ہو گیا۔ ابھی ناچ گانا ہو رہا تھا۔ محفل اپنے شباب پر تھی۔ وہ چُپ چاپ ایک کونے میں بیٹھ گیا اور آنسو بہانے لگا۔

بہلول اِس لحاظ سے خُوش قسمت تھا کہ اُس کے دوستوں کی تعداد دُشمنوں سے زیادہ تھی۔ اگلے روز اس کے وہ دوست، جو دربار میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے، بادشاہ کے سامنے حاضر ہوئے اور بہلول کو معاف کر دینے کی درخواست کی۔ لیکن بادشاہ بولا:

”اگر میں اُسے چھوڑنا چاہوں بھی تو ایسا نہیں کر سکتا کیوں کہ میں نے خُدا کی قسم

کھائی ہے اور میں قسم کو توڑ نہیں سکتا۔"

امیروں وزیروں نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ "حضُور، آپ کسی طریقے سے اُس کی جان بخشی کر سکتے ہیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ بہلول کو اُس وقت پنجرے میں ڈالا جائے، جب شیر اس میں نہ ہو۔"

"میں نے مسخرے کو شیر کے آگے ڈلوانے کی قسم کھائی تھی۔ پنجرے میں ڈالنے کی نہیں۔"

درباری سر جھکائے، چُپ چاپ جانے لگے تو بادشاہ نے اُنہیں بُلا کر کہا۔ "میں صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ شیر کے پنجرے کے دونوں دروازے کھُلے چھوڑ دیے جائیں۔ اگر بہلول ایک دروازے سے داخل ہو کر دوسرے دروازے سے نِکل گیا تو اُس کی خوش نصیبی۔"

بہلول کے دوست دربار سے باہر آئے تو ایک دُوسرے سے کہنے لگے:

"بھئی، یہ تو کوئی بات نہ ہُوئی۔ ہم یوں ہی خُوش ہو گئے۔"

ان کے چہرے پھر لٹک گئے۔ لیکن پھر اُنہوں نے سوچا کہ شیر کے رکھوالے سے مل لیں۔ شاید وہ ہماری مدد کرے۔

یہ سوچ کر وہ شیر کے رکھوالے کے پاس گئے اور بادشاہ نے جو کچھ کہا تھا وہ اُسے بتایا۔ پھر پوچھا کہ کیا شیر کے پنجرے میں سے گُزرا جا سکتا ہے، رکھوالے نے مایوسی سے سر ہلا دیا۔ جناب، پنجرا بے شک بہت بڑا ہے، لیکن شیر بُہت پھُرتیلا ہوتا ہے۔ وہ ایک دفعہ اُچھلا اور مسخرے کا کام تمام ہُوا۔"

"بھائی، ہمیں کوئی راستہ بتاؤ تاکہ ہم اپنے پیارے دوست کی زندگی بچا سکیں۔"

"میں جو کچھ کر سکتا ہُوں، ضرُور کروں گا۔ کل میں شیر کو خوب پیٹ بھر کر کھلاؤں گا۔ وہ پنجرے میں آرام سے لیٹا رہے گا اور بہلول اُس کے آگے سے گُزرا تو اُسے کُچھ نہ کہے گا۔"

بہلول کے دوست خُوشی سے چلّائے۔ "خُدا تُم پر اپنی برکتیں نازل کرے۔"

اب یہ لوگ بہلول کی تلاش میں نکلے۔ کہیں نہ ملا تو شاہی باورچی خانے میں گئے۔

بہلول وہاں اپنے دوست ابُو سعد خواجہ سرا کے پاس بیٹھا تھا۔ ابُو سعد خواجہ سرا سیاہ فام، موٹا تازہ، جِن کا جِن تھا۔ وہ بہلول کی ڈھارس بندھانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ مگر بہلوں کو کسی طرح چین نہ آتا تھا۔ موت سر پر منڈلا رہی ہو تو چین کہاں۔ وہ روئے جاتا تھا۔ دوستوں نے اُسے بادشاہ کا فیصلہ اور رکھوالے کا وعدہ سُنایا تو اُس کی آنکھیں ایک دم چمک اُٹھیں۔ اُس نے جلدی جلدی آنسو خشک کیے اور بولا:

"ابُو سعد، ابُو سعد۔ میرے یار تُم بھی میری مدد کر سکتے ہو کیوں کہ تُمھیں بادشاہ کے زنان خانے میں جانے کی اجازت ہے۔ تم فوراً وہاں جاؤ اور کسی کنیز سے کہنا کہ بادشاہ کی بیٹیوں کے زرق برق کپڑے لا کر تُمھیں دے دے۔"

ابُو سعد نے بہلول کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ پاگل ہو گیا ہو۔ لیکن بہلول نے ایک ٹانگ پر ناچتے ہُوئے کہا۔ "جلدی جاؤ، جلدی۔ یہ وقت ضائع کرنے کا موقع نہیں ہے۔" ابُو سعد بھاگا بھاگا بادشاہ کے زنان خانے میں گیا اور جلد ہی کپڑے لے کر آ گیا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت بادشاہ کھُلے میدان میں آیا، جہاں شیر کا پنجرا رکھا گیا تھا۔ پہرے داروں کا سردار جو سب سے بڑا جلّاد بھی تھا، پہلے سے وہاں موجود تھا۔ شیر کا رکھوالا بھی آ چُکا تھا۔ بے شمار تماش بین جمع تھے۔ اس قسم کا ہولناک نظّارہ کبھی کبھار دیکھنے میں آتا تھا۔ کوئی مسخرہ شیر کا نوالہ بنے یا عام آدمی، منظر دیکھنے سے تعلّق رکھتا تھا، اس لیے دیکھنے والے کھنچے چلے آرہے تھے۔ بعض تماشا دیکھنے آئے تھے، بعض کو بہلول سے ہمدردی تھی اور وہ اللہ سے دُعا مانگ رہے تھے کہ بہلول شیر کے مُنہ سے بچ نکلے۔ البتّہ دُشمن یہ دُعا کر رہے تھے کہ اللہ کرے شیر مسخرے کو کھا جائے۔

"مسخرے کو حاضر کرو۔" بادشاہ نے حکم دیا۔

جُوں ہی نقّارے پر چوٹ پڑی اور گھنٹیاں بجیں، بہلول کُود کر میدان میں آ گیا۔ اُس نے سُرخ رنگ کا تنگ پاجامہ پہن رکھا تھا۔ اور گہرے لال رنگ کی صدری تھی، کمر میں مختلف رنگوں کے پٹکے لٹک رہے تھے، جن پر چھوٹے چھوٹے آئینے، کانچ کے ٹکڑے، موتی اور نہ معلوم کیا کیا ٹانک رکھا تھا۔ اُس نے چہرے

پر خُوب سُرخی پوڈر تھوپ رکھا تھا اور آنکھوں میں گہرا کاجل لگایا تھا۔ ٹوپی میں موتی، شُتر مرغ کے پَر اور گھونگے لٹک رہے تھے۔ اس کے ایک ہاتھ میں طنبورہ تھا اور دوسرے میں خنجری۔

بہلول کا یہ حُلیہ دیکھ کر بادشاہ نے بڑی مُشکل سے اپنی ہنسی روکی۔ اس نے سوچا، کاش میں اس مسخرے کی جان بچا سکتا، لیکن قسم نہیں توڑی جا سکتی تھی۔ اُس نے چہرے پر شاہانہ سنجیدگی لاتے ہوئے حکم دیا:

"پنجرا کھُول دو اور مسخرے کو اندر دھکیل دو۔"

جلّاد نے پنجرے کا دروازہ کھولا اور بہلول کو اندر دھکیل کر جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ شیر پنجرے کے ایک کونے میں لیٹا ہوا تھا۔ اُس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ اُس نے اپنے پنجرے میں آنے والے کو گھور کر دیکھا۔ بہلول کی روح کانپ گئی۔ وہ ایک طرف ہٹ گیا۔ پھر شیر نے اپنا بڑا سا سر اُٹھایا اور پنجوں کے بل اُٹھ کر

بہلول کی طرف دیکھا۔ بہلول نے ایک قدم اور اُٹھایا۔ پھر تیزی سے شیر کے سامنے ناچنے لگا۔ وہ طنبورہ بجا رہا تھا، جنجری چھنکا رہا تھا اور ملنگوں کی طرح مستانہ وار ناچ رہا تھا۔ پھر اچانک ایک لمبی چھلانگ لگا کر وہ اور آگے بڑھا۔

شیر ڈر کے پیچھے ہٹ گیا۔ بہلول نے دو تین لمبے ڈِگ بھرے۔ اب وہ آدھا پنجرا پار کر چُکا تھا۔ شیر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے انگڑائی لے کر ایسے جسم کو سیدھا کیا، جیسے حملہ کرنے والا ہو۔ مسخرہ بدستور ناچ رہا تھا۔ جِتنا شور مچا سکتا تھا، مچا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ شیر ہچکچا رہا ہے۔ پھر اچانک وہ زور سے اُچھلا۔

شیر نے کچھ دیر کر دی کیوں کہ بہلول پنجرے کے دوسرے سِرے تک پہنچ چُکا تھا۔ رکھوالے نے فوراً دوسرا دروازہ کھول دیا۔ بہلول باہر آ گیا۔ اُس کی جان بچ گئی تھی۔

تماشائیوں نے خُوشی کے نعرے لگائے، شاباش! شاباش! بادشاہ ہنس ہنس کر دیوانہ ہُوا جارہا تھا۔ اُس کے مُنہ سے شاباش کا لفظ تک نہ نِکل رہا تھا۔

اس رات بادشاہ نے بہلول کو بُلایا تو معلُوم ہُوا کہ وہ تو غائب ہے۔ وہ کہیں چھُپ گیا تھا۔ اُسے بادشاہ پر بھروسا نہیں رہا تھا۔ کیا خبر کب بادشاہ کو غصّہ آ جائے اور موت کا حکم سُنا دے۔ اس پر بادشاہ نے وزیر کو حکم دیا کہ کچھ بھی ہو میرے مسخرے کو ڈھونڈ کے لاؤ۔

وزیر نے بہلول کو سڑکوں، گلیوں، باغوں، ہوٹلوں اور حمّاموں میں تلاش کیا اور جب یہاں نہ ملا تو وہ اُس محلّے میں گیا جہاں غریب غُربا رہتے تھے۔ بہلول اسی محلّے کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا۔ وزیر نے اُس سے کہا:

"بادشاہ سلامت نے تُمھیں بلایا ہے. ابھی میرے ساتھ چلو۔"

"نہیں۔ ہرگز نہیں۔" بہلول نے جواب دیا۔ "میں بھر پایا بادشاہ سے اور اُس کے دربار سے۔ مُفلسی میں جینا شیر کا نوالہ بننے سے بہتر ہے۔"

بادشاہ نے وزیر کو تاکید کی تھی کہ بہلول کو ساتھ لے کر آنا۔ وہ ایک دوسرے سے بحث کرنے لگے۔ بحث کرتے کرتے دِن گُزر گیا۔ رات ہو گئی۔ آخر بہلول نے واپس جانے کے لیے چند شرطیں پیش کیں۔ اُس نے کہا:

”سب سے پہلے تو بادشاہ قسم کھائے کہ اگر اُس نے مُجھے جان سے مارنے کی دھمکی دی تو وہ بستر پر نہیں سوئے گا۔“

”بادشاہ سلامت یہ قسم ضرُور کھائیں گے۔“ وزیر نے جواب دیا۔

”دوسری شرط یہ ہے کہ میرے لیے ایک شان دار مکان بنایا جائے۔“

”بنا دیا جائے گا۔“ وزیر نے وعدہ کیا۔

”تیسری شرط یہ ہے کہ اگر میں بادشاہ سے کوئی سوال کروں تو وہ اس ٹھیک جواب دے۔“

وزیر نے کہا ”اس بات کے بارے میں مَیں کُچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ بادشاہ کا اپنا مُعاملہ ہے۔ خیر اب میں چلتا ہُوں۔ بادشاہ سے پُوچھ کر جواب دوں گا۔“

وزیر نے بہلول کی تمام شرطیں بادشاہ کے سامنے پیش کیں۔ آخری شرط سُن کر بادشاہ خوب ہنسا اور بولا:

”مجھے معلُوم ہے کہ مسخرہ کیا پُوچھنا چاہتا ہے۔ اُس سے کہہ دو جو کچھ وہ پُوچھے میں

اُس کا جواب دینے کے لیے تیّار ہوں۔ لیکن جواب تنہائی میں دُوں گا، اور وہ بھی وعدہ کرے کہ کسی کے سامنے میرا راز فاش نہ کرے گا۔"

وزیر بادشاہ کا پیغام لے کر بہلول کے پاس آیا۔ دونوں نے مل کر کافی پی۔ تب وزیر نے بادشاہ کا جواب سُنایا۔ بہلول خُ ُوش ہو کر بولا:

"میرے لیے بھی یہی اچھّا ہے کہ میں راز کو راز رکھوں۔ چلیے میں تیّار ہوں۔"

اُس رات مسخرے نے مُدّت کے بعد بادشاہ کے سامنے رقص کیا اور نئے لطیفے سُنائے۔ بادشاہ اور درباری خُوب دِل کھول کر ہنسے۔ سب بے حد خُوش تھے۔ ناچ گانے کے بعد بادشاہ نے درباریوں کو جانے کا حکم دیا۔ بہلول وہیں بیٹھا رہا۔ جب سب درباری چلے گئے تو بادشاہ نے کہا:

"پُوچھو، کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"جان کی امان پاؤں تو عرض کرُوں۔" بہلول عاجزی سے ہاتھ جُوڑ کر بولا۔

"بات یہ ہے حضُور، کہ جشن کی رات میں ذرا بہک گیا تھا۔ جو مُنہ میں آیا بکتا چلا

گیا۔ میں نے آپ کو احمق کہا، کُبڑا کہا۔ کنجوس مکھّی چُوس کہا۔ حضُور سب کے ساتھ مِل کر ہنستے رہے، لیکن پھر۔ پھر اچانک آپ کو کِسی بات پر غصّہ آ گیا۔ میری سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آئی۔" بادشاہ بولا۔ "تُم نے مُجھے احمق کہا۔ سارا زمانہ جانتا ہے کہ میں احمق نہیں ہوں۔ تُم نے مُجھے کنجُوس کہا۔ سب جانتے ہیں کہ میں کنجُوس نہیں ہوں۔ تُم نے مُجھے ٹیڑھی ٹانگوں والا کُبڑا کہا۔ ساری رعایا جانتی ہے میں کُبڑا نہیں ہوں اور نہ ہی میری ٹانگیں ٹیڑھی ہیں۔ یہ سب باتیں غلط تھیں، اس لیے لوگ ہنستے رہے اور میں بھی ہنستا رہا۔"

"پھر؟" بہلول نے پُوچھا۔ "پھر آپ اچانک ناراض کیوں ہو گئے؟"

بادشاہ نے اپنی پگڑی کھولتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "پھر اچانک تُم چلّانے لگے کہ بادشاہ گنجا ہے۔ اور یہ بات شاید تُم کو بھی معلُوم نہیں کہ میں سچ مُچ گنجا ہوں۔"

بہلول حیرت سے بادشاہ کی گنجی چاند کو دیکھ رہا تھا۔ بادشاہ نے آہستہ سے کہا:

"سچّی بات آدمی کو ناراض کر دیتی ہے۔ یہ کہہ کر بادشاہ نے پگڑی دوبارہ سر پر رکھ لی۔

جادُو کی انگوٹھی

پہاڑوں کا بادشاہ ایک رات آرام کی نیند سو رہا تھا کہ اُسے خواب میں ایک بزُرگ دکھائی دیے۔ بزُرگ نے کہنا شروع کیا:

”اے بادشاہ۔ کل صُبح جب سُورج نِکلے تو گھوڑے پر سوار ہو کر جنُوب کی طرف جانا۔ پھر اُس درّے میں گھوڑا ڈال دینا جو پہاڑوں کے درمیان سے گُزرتا ہے۔ یہ درّہ پہاڑوں کی ڈھلانوں پر ختم ہو گا۔ ان ڈھلانوں میں غار ہیں۔ یہاں تُمہارا گھوڑا اپنے آپ رُک جائے گا۔ بس جہاں گھوڑا رُکے وہیں سے کھُدائی شروع کر دینا۔ کھودتے کھودتے تُمہیں ایک راستہ نظر آئے گا۔ اس راستے سے نیچے اُترنا۔“

”اس کے بعد؟“ بادشاہ نے پُوچھا۔

اس راستے کے آخر میں ایک کھُلی جگہ ہے۔ یہاں تُمہیں ایک خزانہ ملے گا۔ اس کی جگہ کے عین درمیان پیتل کا ایک بُت پڑا ہے۔ بُت کی اُنگلی میں انگوٹھی ہے۔

جب تُم اس انگوٹھی کو چھُوؤ گے تو بُت چِلاّ اُٹھے گا۔ اس کی طرف دھیان نہ دینا اور خوفزدہ نہ ہونا۔ بُت کی اُنگلی سے انگوٹھی اُتار کر اپنی اُنگلی میں پہن لینا۔"

"اے بزُرگ، اِس انگوٹھی میں کیا خوبی ہے؟" بادشاہ نے سوال کیا۔

"اس انگوٹھی کی خاصیّت یہ ہے کہ جب تک تُم اسے پہنے رہو گے تُمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ جب اُس کو اُتار کر ہاتھ میں پکڑ لو گے تو ایک جِن حاضر ہو جائے گا۔ یہ جِن تُمہارے قبضے میں ہو گا۔ اور تُمہارے ہر حُکم کی تعمیل کرے گا۔ انگوٹھی کو مُنہ میں رکھ لو گے تو تُم سب کو دیکھ سکو گے، تُمہیں کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔"

بادشاہ کی آنکھ کھُلی تو وہ پریشان تھا۔ اتنا لمبا اور اس قدر صاف خواب اُس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اسے خواب کی ہر بات یاد تھی۔ خواب یا تو خُدا کی طرف سے آتے ہیں یا شیطان بہکاتا ہے۔ بادشاہ کو ڈر تھا کہ اگر خواب شیطانی ہے تو وہ بزُرگ کا کہنا مان کر شیطان کے چُنگل میں پھنس جائے گا۔ یہ سوچ کر اُس نے خواب کے مطابق عمل نہ کیا بلکہ اس دِن گھوڑے کی سواری بھی نہ کی کہ کہیں گھوڑا خُود بخُود

پہاڑوں کی طرف نہ چل پڑے۔

اگلی رات بادشاہ کو پھر وہی خواب نظر آیا۔ وہی سفید داڑھی والے بزُرگ وُہی باتیں دُہرا رہے تھے۔ تیسری رات بھی ایسا ہی ہُوا۔ اب بادشاہ کو یقین ہو گیا کہ یہ خواب اللہ کی طرف سے ہے، شیطان کی طرف سے نہیں۔ صُبح ہوتے ہی وہ اُٹھا، گھوڑے پر سوار ہوا اور جنوب کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہ تنگ درّے میں چلتا گیا۔ جب ڈھلانیں شرُوع ہوئیں تو دونوں طرف غار بھی نظر آنے لگے۔ اچانک ایک جگہ اُس کا گھوڑا رُک گیا۔

"یہی وہ جگہ ہے۔" بادشاہ نے سوچا۔

وہ بیلچہ ساتھ لایا تھا۔ گھوڑے کو ایک پتھّر سے باندھ کر وہ ٹھیک اُس جگہ کو کھودنے لگا جہاں گھوڑا رُک گیا تھا۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ لوہے کا دروازہ نظر آیا۔ بادشاہ نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ کیا دیکھتا ہے کہ نیچے سیڑھیاں جاتی ہیں اور کہیں اندھیرے میں گُم ہو جاتی ہیں۔

بادشاہ نے جیب سے موم بتّی نکالی اور جلا کر نیچے اُترنے لگا، سیڑھیاں بادشاہ کو ایک بل کھاتے، لمبے اندھیرے راستے پر لے گئیں۔ راستہ ایک کُشادہ غار میں ختم ہوتا تھا۔ یہ غار پہاڑ کے اندر بہُت دُور تک چلا گیا تھا۔ بادشاہ نے دیکھا کہ اُس کے چاروں طرف سونے کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ اُس نے خزانے کی طرف کوئی توجّہ نہ دی۔ غار کے عین درمیان پیتل کا بُت رکھا تھا۔ اس کا قد انسان کے قد کے برابر تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پیتل کی تلوار تھی اور دوسرا ہاتھ غار کے دہانے کی طرف پھیلا ہُوا تھا۔ اسی ہاتھ کی ایک اُنگلی میں سونے کی انگوٹھی تھی۔

بادشاہ نے ہاتھ بڑھا کر انگوٹھی اُتارنی چاہی تو غار میں عجیب سا شور اُٹھا۔ بُت یوں چیخ رہا تھا جیسے بُت نہیں، انسان ہو۔ دھات کے بُت سے نکلنے والی آوازیں جب کھُلے غار کی دیواروں سے ٹکرائیں تو یوں لگا جیسے فوج دھاڑ رہی ہو۔

بادشاہ نے پہلے تو ڈر کر ہاتھ کھینچ لیا، لیکن پھر حوصلہ کر کے بُت کی اُنگلی سے انگوٹھی اُتار لی۔ انگوٹھی اُنگلی میں پہننے کی دیر تھی کہ سارا شور ختم ہو گیا، اور بُت ایک دھماکے سے اوندھے مُنہ زمین پر گِر پڑا۔ غار میں مکمّل خاموشی چھا گئی۔

بادشاہ غار سے باہر نِکل آیا۔ تازہ ہوا اور سُورج کی روشنی میں آکر اُس کے ہوش ٹھکانے آئے۔ اُس نے اُنگلی سے انگوٹھی اُتاری اور ہاتھ میں پکڑ لی۔ فوراً ہی ایک لمبا تڑنگا سیاہ جِن سامنے کھڑا ہوا اور سر جھکا کر بولا:

"میرا نام میمُون ہے۔ حکم کیجیے۔"

"اس غار کا تمام خزانہ اُٹھا کر میرے خزانے میں پہنچا دو۔" بادشاہ نے حکم دیا۔

"حضور کا حکم سر آنکھوں پر۔" یہ کہہ کر میمُون جِن غائب ہو گیا۔

بادشاد نے انگوٹھی مُنہ میں رکھ لی۔ اب وُہ کسی کو نظر نہ آ سکتا تھا۔ اُس نے اپنا ہاتھ دیکھا تو وہ نظر نہ آیا۔ پاؤں کی طرف نظر کی تو پاؤں بھی دکھائی نہ دیے۔ اس کو تسلّی ہو گئی کہ خواب والے بزُرگ نے جو کُچھ کہا تھا، وہ دُرست تھا۔ اُس نے انگوٹھی دوبارہ اُنگلی میں پہن لی اور گھوڑے پر سوار ہو کر محل میں واپس آ گیا۔

انگوٹھی کا راز بادشاہ نے کِسی کو نہ بتایا۔ اپنے تین بیٹوں سے بھی چھُپائے رکھا۔ خُود بھی بلا وجہ انگوٹھی کر اِستعمال نہ کرتا تھا۔ کئی برس گُزر گئے۔ بادشاہ بُوڑھا ہو

گیا اور ایک دن بیمار ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ زندگی کی کوئی اُمّید نہ رہی تو اُس نے بڑے بیٹے کو بُلایا اور اس سے کہا:

''بیٹا، تم میرے تخت و تاج کے وارث ہو۔ میری آدھی دولت بھی تُمہاری ہے۔''

یہ سُن کر بڑا بیٹا بے حد خُوش ہوا۔ اب بادشاہ نے منجھلے بیٹے کو بُلایا اور بولا:

''بیٹا، باقی دولت تُمہاری ہے۔ خُوش رہو۔'' منجھلا بیٹا بھی بہت خوش ہُوا۔

بادشاہ کے تیسرے بیٹے کا نام علی رضا تھا۔ اُس نے باپ کا فیصلہ سُنا تو سیدھا اُس کے پاس آیا اور بولا:

''ابّا جان، آپ نے یہ کیا کِیا۔ آپ کو اپنا تیسرا بیٹا یاد نہیں رہا۔ آپ نے مُجھے بالکل بھُلا دیا؟''

''نہیں بیٹا، میں نے تُمھیں نہیں بھُلایا۔ تُمہارا حصّہ میری ساری سلطنت سے بڑا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مُجھے تُمہارے بڑے بھائی بھی پیارے ہیں، مگر تُم

مُجھے سب سے زیادہ پیارے ہو۔ لیکن یہ راز راز ہی رہے کہ میں تُم سے بہت پیار کرتا تھا۔ اسی میں تُمہاری بھلائی ہے۔"

یہ کہہ کر بادشاہ نے جادُو کی انگوٹھی علی رضا کو دے دی اور اُس کی تمام خُوبیاں بھی اُسے سمجھا دیں۔

اس واقعے کے کُچھ دن بعد بادشاہ اللہ کو پیارا ہو گیا اور بڑا بیٹا تخت پر بیٹھا۔ تینوں بھائی مل جُل کر ہنسی خُوشی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اُنہیں ایک دوسرے سے دُشمنی یا حسد نہ تھا۔ علی رضا نے ایک آدھ بار جادُو کی انگوٹھی کو آزمایا۔ اُس میں واقعی وُہ خُوبیاں تھیں جو باپ نے بتائی تھیں۔ پھر اُسے انگوٹھی اِستعمال کرنے کا خیال ہی نہ آیا، کیوں کہ اُسے زیادہ دولت کی ہوس نہ تھی۔ اس کی تمام ضروریات اچھّی طرح پُوری ہو رہی تھیں۔

ایک دن علی رضا کو اچانک احساس ہوا کہ اُس کا بڑا بھائی کچھ پریشان ہے۔ اُس نے پُوچھا:

"کیا بات ہے، بھائی جان؟ آپ چُپ چُپ سے کیوں ہیں؟ کیا کوئی خاص بات

ہو ئی ہے ؟"

"ہمارا مُلک سخت خطرے میں ہے۔ بس یہی فکر دن رات مُجھے کھائے جا رہی ہے۔"

"کیسا خطرہ، بھائی جان؟" علی نے پُوچھا۔ بادشاہ نے کہا۔ "تُم جانتے ہو کہ ہماری سلطنت کے ہمسائے میں جس بادشاہ کی سلطت ہے وُہ بُہت لالچی اور حریص ہے۔ اس نے ہزاروں کی تعداد میں فوج جمع کر لی ہے اور ہم پر شمالی سرحد سے حملہ کرنے کی سوچ رہا ہے۔"

علی ہنسا اور بولا۔ "بھائی جان، بس اِتنی سی بات؟ آپ مُجھے دس منٹ کی مہلت دیں۔ میں ابھی اس بادشاہ کو زنجیروں میں جکڑ کر آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں گیا اور انگوٹھی اُنگلی میں سے اُتار کر ہاتھ میں پکڑ لی۔ اُسی وقت میمُون جِن حاضر ہو گیا۔ علی نے حکم دیا:

”پڑوس کی سلطنت کے بادشاہ کو پکڑ کر ہمارے محل میں لے آؤ۔“

ایک لمحے بعد بادشاہ محل میں موجود تھا۔ علی بادشاہ کو لے کر دربار میں گیا اور اُس سے کہا:

”فوراً میرے بھائی کے قدموں میں گِر کر معافی مانگو۔“

بڑے بھائی کے ہوش اُڑ گئے۔ وہ سمجھ نہیں سکا کہ دُشمن آپ ہی آپ اُس کے پاس کیسے چلا آیا۔ کُچھ دیر تو اُس کے مُنہ سے کُچھ نہ نِکلا، پھر وہ سنبھل کر بولا:

”اے بادشاہ، میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے جو تُو میرے مُلک پر چڑھائی کرنے کے منصوبے بنا رہا ہے؟ تیرا اپنا ہی مُلک بہُت بڑا ہے، پھر میرے مُلک کو کیوں لینا چاہتا ہے؟“

بادشاہ نے گِڑگِڑاتے ہوئے کہا:

”مُجھے معلُوم نہ تھا کہ آپ کے قبضے میں جِن ہے اور اس سے آپ سب کُچھ کروا سکتے ہیں۔“ پھر اُس نے معافی مانگی اور کہا۔ ”اگر آپ مُجھے آزاد کر دیں تو میں

ساری عُمر آپ کا غُلام رہوں گا۔"

"جاؤ، تُم آزاد ہو۔" علی کے بھائی نے کہا اور غُلاموں کو اِشارہ کیا کہ وہ بادشاہ کی زنجیریں کھول دیں۔ لیکن ان سے زنجیریں نہیں کھلیں۔ اُنہوں نے زنجیریں توڑنے کی بہُت کوشش کی مگر بے کار۔"

آخر قیدی بادشاہ نے کہا:

"یہ زنجیریں وُہی کھول سکتا ہے جس نے مُجھ کو باندھا ہے۔"

اتنے میں علی بھی آ پہنچا۔ اُس کے ہاتھ لگاتے ہی ساری زنجیریں غائب ہو گئیں۔ علی نے کہا: اب آپ جہاں چاہیں جا سکتے ہیں، لیکن اپنا وعدہ نہ بھُولیے گا۔"

بادشاہ نے کہا۔ "آپ جانتے ہیں میرا مُلک یہاں سے تین مہینے کی دوری پر ہے۔ گھوڑے پر سوار ہو کر تین مہینے بھاگتا رہوں تب کہیں پہنچ سکوں گا۔ اس عرصے میں مُجھے مُردہ سمجھ کر کوئی اور تخت پر بٹھا دیا جائے گا۔"

یہ سن کر بادشاہ علی کی طرف مُتوَجّہ ہُوا اور کہا:

”علی، میرے بھائی۔ تُم ہی اس کو لائے تھے، اب تُم ہی اِسے پہنچا کر آؤ۔“

علی بادشاہ کو لے کر اپنے کمرے میں گیا، اُنگلی سے انگوٹھی اُتاری اور جِن کو حکم دیا کہ بادشاہ کو اُس کے مُلک میں پہنچا دو۔

اُس وقت تک علی کے دونوں بھائیوں کو پتا چل چُکا تھا کہ چھوٹے بھائی کے پاس جادُو کی طاقت ہے اور وہ اُس کے بل بُوتے پر جو چاہے کر سکتا ہے۔ دونوں بھائی علی رضا سے ڈرنے لگے۔

ایک دن بادشاہ نے منجھلے بھائی سے کہا۔ ”ہمیں اس راز کو معلُوم کرنا چاہیے کہ علی کے پاس کون سی جادُو کی طاقت ہے؟“

منجھلے نے جواب دیا۔ ”آج ہم ایک بُہت بڑی دعوت کا اِنتظام کرتے ہیں۔ رعایا سے کہہ دیجیے کہ پڑوس کے بادشاہ کے حملے کا خطرہ ٹل گیا، اس لیے مُلک بھر میں جشن منایا جائے۔“

دوسرے دِن محل میں بُہت بڑے جشن کا اِنتظام کیا گیا۔ طرح طرح کے کھانے

پکوا کر بڑی بڑی سینیوں میں سجا دیے گئے۔ دستر خوان پر پانچ مہمانوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ زعفرانی پلاؤ سے بھرے ہُوئے بڑے بڑے طباق چُنے گئے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سالم دُنبے بھُون کر رکھ دیے گئے۔ نرگسی کوفتے، شامی کباب، سیخ کباب، مُرغ، قسم قسم کے اچار، مُربّے، چٹنیاں اور مٹھائیاں۔ غرض کون سی نعمت تھی جو وہاں نہیں تھی۔ جب سب لوگ کھا رہے تھے تو منجھلے بھائی نے چھوٹے بھائی علی سے کہا:

”کاش دستر خوان پر بغداد کے لیمُوں بھی ہوتے۔ بس اُن کی کمی رہ گئی ہے۔ گوشت لیمُوں کے بغیر مزا نہیں دیتا۔ پر لیمُوں ہوں تو بغداد کے۔“

”یہ کون سی بڑی بات ہے۔ ابھی حاضر کرتا ہُوں۔“ یہ کہہ کر علی نے بلا سوچے سمجھے اُنگلی سے انگوٹھی اُتاری۔ اُسی وقت میمُون حاضر ہو گیا۔ علی نے اُس سے کہا:

”ابھی، اِسی وقت، ایک درجن تازہ بغدادی لیمُوں پیش کرو۔“

ایک منٹ گُزرا تھا کہ بغداد کے تازہ لیمُوں پلیٹ میں رکھے ہوئے سامنے آ گئے۔

بڑے اور منجھلے بھائیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور دم بخُود رہ گئے۔ رات کو جب مہمان چلے گئے تو دونوں بھائی اکٹھے بیٹھ کر علی رضا سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تجویزیں سوچنے لگے۔ علی کی ایک خاص کنیز چھُپ کر اُن کی باتیں سُن رہی تھی۔ وہ بھاگی بھاگی علی کے پاس گئی اور سارا قصّہ کہہ سُنایا۔

"اگر یہ بات ہے تو میں بھائیوں کے پاس نہیں رہوں گا۔" علی نے فیصلہ کیا اور اُسی روز گھر چھوڑ کر نِکل کھڑا ہوا۔ راستے میں اُس نے انگوٹھی اُتار کر ہاتھ میں لی اور جِن آیا تو اُس سے کہا:

"مُجھے یہ بتاؤ کہ دُنیا کا سب سے حسین مُلک کون سا ہے؟"

"جزیرہ کمفر، جو بحیرۂ قُلزم میں ہے۔" میمُون نے جواب دیا۔

"دنیا میں سب سے حسین لڑکی کون ہے؟" علی نے پُوچھا۔

"شہزادی فاطمہ۔ یہ جزیرہ کمفر کے بادشاہ کی بیٹی ہے۔ اس کا رنگ گورا، ہونٹ سُرخ اور بال سیاہ ہیں۔ اس جیسی خُوب صُورت لڑکی دُنیا جہان میں نہیں۔"

”تو پھر مجھے جزیرہ کمفر لے چلو۔“ علی نے حکم دیا۔

جِن اُسی وقت اس کو جزیرہ کمفر کی طرف لے اُڑا۔ راستے میں وہ ندیوں، پہاڑوں اور وادیوں پر سے گزرے۔ پھر سُمندر کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ آخر جزیرہ کمفر میں پہنچ گئے۔ جزیرہ کیا تھا ایک خُوب صُورت باغ تھا۔ جدِھر دیکھو پھُول ہی پھول تھے، جن کی خوش بُو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ نیلے سُمندر نے جزیرے کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ جزیرے میں ایک شہر بھی تھا۔ اُس کی سفید رنگ کی عمارتیں سُورج کی روشنی میں بُہت بھلی لگتی تھیں۔ شہر کے ایک سِرے پر بہت بڑا شاہی محل تھا۔

یہاں پہنچ کر علی نے انگوٹھی مُنہ میں رکھ لی۔ اب وہ کسی کو دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ بڑی آسانی سے محل میں داخل ہو گیا اور باغ میں سیر کرنے لگا۔ اِتنے میں سے شہزادی فاطمہ ایک جگہ بیٹھی نظر آئی اس کے ساتھ اس کی کنیز بھی تھی۔ کنیز کا نام تھا سلوا۔ علی غور سے فاطمہ کو دیکھنے لگا۔ فاطمہ سچ مُچ بے حد خُوب صُورت تھی۔ ایسی حسین لڑکی اُس نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔

اگلے دن علی نے شہزادوں کا سا لباس پہنا اور ایک خُوب صُورت گھوڑے پر سوار ہو کر محل میں گیا۔ اُس نے بادشاہ کو بتایا کہ وہ ایک مُلک کا شہزادہ ہے، جو یہاں سے بہت دُور ہے۔ پھر اُس نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

”میں آپ کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ میں آپ کی بیٹی فاطمہ سے شادی کا خواہش مند ہوں؟“

بادشاہ ہنسا اور بولا۔ ”تُم جیسے پاگل پہلے بھی آ چُکے ہیں۔ وہ بھی بادشاہوں اور وزیروں کے بیٹے تھے۔ لیکن شہزادی فاطمہ کو منانا آسان نہیں۔ اُس نے قسم کھا رکھی ہے کہ میں صرف اُس شخص سے بیاہ کروں گی جو میرے لیے بغداد سے

لیموں، مِصر سے آم اور مدینے سے کھُجوریں لے کر آئے گا۔ یہ سب چیزی ایک ہی موسم میں ملنی چاہیں۔"

"بہت اچھا۔" شہزادے نے کہا۔ "کل ہی لیموں، آم اور کھُجوریں حاضر کر دوں گا۔"

اگلے دن علی پھر محل میں گیا۔ تین غُلام اُس کے پیچھے پیچھے سروں پر خوان اُٹھائے ہوئے آ رہے تھے۔ ایک خوان میں بغداد کے لیموں تھے، دوسرے میں مِصر کے آم اور تیسرے میں مدینے کی کھُجوریں ۔ بادشاہ یہ تحفے دیکھ کر بہُت خُوش ہُوا اور حکم دیا کہ شادی کی رسم آج ہی ادا ہو جائے۔

لیکن شہزادی فاطمہ کے غُصّے کی اِنتہا نہ تھی۔ اُس کی سیاہ آنکھیں اور زیادہ سیاہ ہو گئیں۔ ہونٹ پیلے پڑ گئے۔ اصل میں وہ شادی ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یہ تین شرطیں تو اُس نے اِس لیے رکھی تھیں کہ اُسے یہ کوئی پورا کرے گا، نہ شادی ہو گی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ شرطیں جادُو کے ذریعے پوری ہوئی ہیں۔ مگر شرطیں پُوری ہو چُکی تھیں اس لیے شادی کے لیے ہاں کہنا ضرُوری تھا۔

اُسی دن علی کی شہزادی سے شادی ہو گئی۔ لیکن شہزادی کو اپنے شوہر سے سخت نفرت تھی۔ شوہر ہی سے کیا وہ تو دنیا بھر کے مردوں سے نفرت کرتی تھی۔ اُس نے دل ہی دل میں قسم کھائی کہ وُہ سُراغ لگا کر رہے گی کہ علی نے یہ چیزیں کیسے حاصل کیں۔ وہ دن رات کھوج میں لگی رہتی۔ علی سے مُشکل سے مُشکل کاموں کی فرمائش کرتی۔ دنیا بھر کی قیمتی چیزیں مانگتی۔ کبھی عرب کے بہترین گھوڑے مانگ رہی ہے۔ کبھی دمشق کا ریشم۔ کبھی ہندوستان کے موتی۔ علی سب چیزیں مہیّا کر دیتا۔ مگر ہمیشہ اِحتیاط کرتا۔ جب کبھی میمُون کو بُلا کر کوئی حُکم دینا ہوتا، وُہ اپنے کمرے میں چلا جاتا اور کُنڈی لگا کر اُس سے بات کرتا۔

لیکن ایک دن وہ اپنے کمرے کی کُنڈی لگانا بھُول گیا۔ صرف دروازہ بند تھا۔ فاطمہ نے تھوڑا سا دروازہ کھول دیا اور جب علی نے انگوٹھی اُتاری اور جِن کو بُلایا تو وہ چُپ چاپ دیکھتی رہی۔

رات کو جب علی گہری نیند سو گیا تو فاطمہ نے انگوٹھی اُس کی اُنگلی سے اُتار لی۔ فوراً ہی میمُون جِن سامنے آ کھڑا ہوا۔ شہزادی نے علی کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے

کہا:

"اس آدمی کو وہاں چھوڑ آؤ جہاں سے یہ آیا ہے۔ میمُون کچھ جھِجکا۔ اُسے علی سے محبّت ہو گی تھی۔ لیکن وُہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ وہ تو اُس کا غُلام تھا جس کے پاس انگوٹھی ہو۔ وہ علی کو اُٹھا کر اُسی طرح دریاؤں، پہاڑوں اور وادیوں پر سے اُڑتا ہُوا اُسے اُس کے محل میں چھوڑ آیا۔

علی کی جب آنکھ کھُلی تو اُس نے دیکھا کہ یہ تو اُسی کا محل ہے اور اُس کے ہاتھ میں انگوٹھی بھی نہیں ہے۔ بھائی اُس کے ساتھ بہُت محبّت سے پیش آئے۔ آخر بھائی تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ اُنہوں نے اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ جزیرہ کمفر کو بھُول جاؤ اور ہمارے پاس آرام سے رہو۔

"میں اپنی انگوٹھی حاصل کر کے رہوں گا۔ وُہ مجُھے میرے باپ نے دی تھی۔" علی نے کہا۔ "میں اُسے شہزادی کے پاس نہیں رہنے دُوں گا۔ وُہ جِتنی خُوب صُورت ہے، اُتنی ہی دِل کی کھوٹی ہے۔"

دُوسرے دِن وہ گھوڑے پر سوار ہو کر جزیرہ کمفر کی طرف چل دیا۔ تین مہینے

برابر چلتا رہا۔ تب سُمندر کے ساحل پر پہنچا۔ وہاں جا کر بحری جہاز میں سوار ہو گیا۔ تین ماہ کے سُمندر میں سفر کرنے کے بعد نہر سویز میں پہنچا اور وہاں سے بحیرۂ قُلزم میں پہنچ گیا۔ جب وہ نہر سویز کے کنارے پر تھا تو اسے جزیرہ کمفر کی خبریں ملیں۔ اُس نے سُنا کہ شہزادی فاطمہ اپنے باپ کو قتل کر کے تخت پر بیٹھ گئی ہے اور ملک میں کسی مرد کو داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ صرف عورتیں ہی آ سکتی ہیں۔ جہازوں کی سختی سے تلاشی لی جاتی ہے۔

علی کو یہ اِطّلاع مِلی تو اُس نے اندازہ لگایا کہ شہزادی اُس کی واپسی سے خوف زدہ ہے، تب ہی جہازوں کی تلاشی لی جاتی ہے۔ وہ ایک جہاز کے کپتان سے ملا جو گرم مسالا لے کر کمفر جایا کرتا تھا۔ اس کو اشرفیاں دے کر راضی کیا کہ وہ اُس کے جہاز میں عورت بن کر سفر کرے گا۔

اس طرح علی بُرقع پہن کر جزیرہ کمفر کے ساحل پر اُترا اور ایک سرائے میں رہنے لگا۔

اس کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ رعایا شہزادی کو پسند نہیں کرتی۔ وہ ظالم اور فضول

خرچ تھی۔ مُلک کے حالات بُہت خراب ہو چکے تھے۔ لوگ مُسکرا کر بات کرنا بھُول گئے تھے۔

ایک روز علی محل کے دروازے کے پاس کھڑا تھا کہ اُسے کنیز سلوا باہر نِکلتی دکھائی دی۔ سلوا فاطمہ کی خاص ملازمہ تھی۔ علی اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ جب وہ محل سے کافی دُور آ گئے تو علی نے بُرقع اُتار پھینکا اور سلوا سے کہا:

"سلامُ علیکُم۔ میں علی ہوں۔ تُمہاری شہزادی کا شوہر۔" سلوا حیرانی سے چیخی۔ "خُدا کا شکر ہے کہ آپ آ گئے۔ محل کے حالات بے حد خراب ہیں۔"

"سلوا۔ تمہیں میری مدد کرنا ہو گی۔"

"میں جو کُچھ کر سکتی ہوں، ضرُور کروں گی۔" سلوا نے یقین دلایا۔

"تو پھر میں جو کہوں وہ کرو۔ تُم بیمار بن کر اپنی مالکن کے کمرے میں لیٹ جانا اور خُوب توبہ تلّا کرنا۔ شہزادی پُوچھے تو کہنا کہ بغداد کے تازہ لیموں ہوں تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔"

سلوا اُلٹے پاؤں محل میں گئی۔ شہزادی اس وقت اپنے کمرے ہی میں تھی۔ سلوا سینے پرونے کا کام لے کر شہزادی کے پاس بیٹھ گئی۔ پھر تھوڑی دیر بعد دِل پر ہاتھ رکھ کر ہائے ہائے کرنے لگی۔ شہزادی نے اُس کو اپنے بستر پر لٹا دیا اور ایک غُلام سے کہا کہ فوراً طبیب کو بُلا کر لاؤ۔ لیکن سلوا نے اُسے روک دیا اور کراہتے ہوئے کہا۔ "میرا ایک ہی علاج ہے، شہزادی صاحبہ۔"

"وہ کیا؟"

"بغداد کے تازہ لیمُوں۔"

یہ سُن کر شہزادی نے کہا۔ "آنکھیں بند کرو۔ جب تک میں نہ کہوں، مت کھولنا، ورنہ لیمُوں نہیں ملیں گے۔"

سلوا نے جھُوٹ مُوٹ آنکھیں بند کر لیں۔ شہزادی نے الماری میں سے ایک چھوٹی سی سیڑھی نِکالی، اُسے دیوار پر لگا کر اُوپر چڑھی اور کمرے کے دروازے پر بنے ہوئے طاقچے میں سے سونے کا ڈبّا نِکال لِیا۔ ڈبّے میں ہاتھی دانت کی ڈبیا تھی اور اُس میں جادُو کی انگوٹھی۔ جوں ہی شہزادی نے انگوٹھی نکالی، میمُون جِن

سامنے آ گیا۔ حکم کی دیر تھی کہ بغدادی لیمُوں آ گئے۔

سلوا اپنی لمبی لمبی پلکوں میں سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اب جو شہزادی لیمُوں لے کر اُس کے پاس آئی تو اُس نے زور سے آنکھیں بند کر لیں۔ شہزادی نے آواز دی تو اُس نے آنکھیں کھول دیں اور لیمُوں دیکھ کر خُوشی سے چیخ اُٹھی۔ اگلے دن سلوا علی سے ملی اور اسے سارا حال کہہ سُنایا۔ علی نے کہا۔ "انگوٹھی میرے پاس لے آؤ۔"

سلوا موقع کی تلاش میں رہنے لگی۔ ایک دن شہزادی تھوڑی دیر کے لیے باہر گئی تو سلوا نے الماری میں سے سیڑھی نِکالی، اُسے دیوار پر لگایا اور طاقچے میں سے سونے کا ڈبّا اُتار لیا۔ پھر ڈبّا کھول کر جلدی جلدی انگوٹھی پہن لی اور علی کے پاس پہنچی۔ علی نے انگوٹھی لے لی اور سلوا سے کہا:

"جلدی سے محل میں چلی جاؤ اور یوں ظاہر کرو جیسے کُچھ ہُوا ہی نہیں۔ میں تُمہارے پیچھے پیچھے آتا ہُوں۔"

سلوا چلی گئی تو علی نے میمُون کو بُلایا اور شہزادوں جیسا لباس پہنا۔ پھر انگوٹھی مُنہ

میں رکھ لی اور نظروں سے اوجھل ہو کر محل میں داخل ہو گیا۔ محل میں جا کر اُس نے انگوٹھی اُنگلی میں پہن لی اور شہزادی کے کمرے میں چلا گیا۔

"السّلامُ علیکُم۔" علی نے شہزادی سے کہا۔

"تم یہاں کیسے آ گئے؟" شہزادی ہکّا بکّا رہ گئی اور چیخ کو بولی۔ "خُدا کے لیے یہاں سے چلے جاؤ، مُجھے چین سے رہنے دو۔"

"یہ مُلک میرا ہے۔ تُمہارے باپ نے مُجھے اس کا وارث بنایا تھا۔ اب وہ مر چُکے ہیں، اس لیے میں تخت حاصل کرنے کے لیے آیا ہُوں۔"

شہزادی پتھرا کر رہ گئی۔ تھوڑی دیر کُچھ سوچتی رہی۔ پھر دوڑ کر الماری میں سے سیڑھی نِکال لائی اور طاقچے میں سے سونے کا ڈبّا اُتارا۔ ڈبّا کھول کر ہاتھی دانت کی ڈبیا نکالی۔ اُسے کھول کر دیکھا تو انگوٹھی غائب۔

علی نے اپنا ہاتھ شہزادی کو دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ رہی انگوٹھی۔ میرے ہاتھ میں ہے۔"

شہزادی غصّے سے چیختی چلّاتی باہر کی طرف بھاگنے لگی۔ وہ نوکروں اور پہرے داروں کو بُلانا چاہتی تھی، مگر علی نے اُس کا راستہ روک لیا اور کہا:

”نوکروں کو بُلانے سے کیا فائدہ۔ تُمھاری فوج کے ایک ایک سپاہی کے سامنے میں ہزار ہزار سپاہی کھڑے کر سکتا ہوں۔“

یہ کہہ کر اُس نے انگوٹی اُنگلی میں سے اُتار لی۔ میمُون اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ اُس نے جِن سے پوچھا:

”بتاؤ، ہم اِس شہزادی کے ساتھ کیا سلوک کریں جس کا چہرہ سفید ہے اور دِل کالا۔“

”مالک، میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں صرف حکم ماننا جانتا ہُوں۔“ جِن نے جواب دیا۔

”میں اسے جان سے نہیں ماروں گا، کیوں کہ میری بیوی تھی۔“ علی نے کہا۔ ”لیکن میں اسے آزاد بھی نہیں چھوڑوں گا، کیوں کہ یہ جادُو کی انگوٹھی کے

بارے میں جانتی ہے۔"

میمُون خاموش کھڑا حکم کا اِنتظار کر رہا تھا۔ علی نے کہا۔ "میمُون، شہزادی کو اُٹھا کر اُس غار میں لے جاؤ جہاں سے میرے ابّا جان کو یہ انگوٹھی ملی تھی۔ اس کی وہاں لے جا کر سُلا دو جہاں پیتل کا بُت پڑا تھا۔ یہ وہاں ہزار برس تک سوئی رہے گی۔ یہی اس کی سزا ہے۔"

"جِن شہزادی کو لے کر اُسی وقت غائب ہو گیا۔ علی نے انگوٹھی دوبارہ اُنگلی میں پہن لی۔ اس کے بعد وہ جزیرہ کمفر پر حکومت کرنے لگا۔ رعایا اُس سے بے حد خُوش تھی۔ اُس نے شہزادی کی کنیز سلوا سے شادی کر لی اور وہ دونوں ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگے۔ شہزادی فاطمہ آج تک پہاڑوں کے اندر غار میں پڑی سو رہی ہے۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ جب وہ جاگے گی تو کیا مُصیبت ڈھائے گی۔ لیکن ابھی فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہ کئی سو سال تک سوئی رہے گی۔

سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں

ابُو صابر کا نام افریقہ کے شمال مغربی سواحلی علاقے میں بُہت مشہور ہے، کیوں کہ اُس کی کہانی بڑی عجیب و غریب ہے۔ وہ مُلک تیونس کا بہت امیر سوداگر تھا اور اپنا مال فروخت کرنے کے لیے دُور دُور کے ملکوں میں جاتا تھا۔ صحراؤں میں، پہاڑوں میں، گنجان شہروں اور ان علاقوں میں جہاں زیتون کے باغات ہیں، کھُجوروں کے نخلستان ہیں۔ وہ بحیرۂ روم کے ساحلوں پر مال بردار جہازوں پر اپنا سامان لدواتا، زیتون کے تیل، کھُجور، مچھلی، برتن، چمڑا، اُون اور اسفنج وغیرہ کی تجارت کرتا اور خُوب روپیہ کماتا۔

ابُو صابر قسمت کا دھنی تھا۔ جس چیز کو ہاتھ لگاتا وہ سونا ہو جاتی۔ رفتہ رفتہ وہ شِمالی افریقہ کا امیر ترین سوداگر بن گیا۔ عام طور پر سوداگر اور امیر لوگ کنجُوس ہوتے ہیں، لیکن ابُو صابر نہایت سخی تھا۔ جتنا روپیہ کماتا، اُتنی ہی خیرات کرتا۔

اُس کے دروازے سے کوئی سوالی خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتا:

”اَلحمدُ لِلّٰہ (سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں)، ہم سب ایک خُدا کے بندے ہیں۔ دُنیا کی ہر چیز کا مالک خُدا ہے۔ سب کچھ اُسی کا بنایا ہوا ہے۔ اس لیے ہر امیر غریب کو چاہیے کہ جو کُچھ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں دیا ہے، اللہ کی راہ میں خرچ کریں“

ان خُوبیوں کی وجہ سے ابُو صابر کچھ ہی عرصہ میں مشہور ہو گیا۔ غریب لوگ اُس کی دولت اور صِحّت کی دُعائیں مانگتے۔ امیر، غریب سب ہی اُس کی باتیں کرتے۔ گھر ہو یا محل، مسجد ہو یا سرائے، لوگ ابُو صابر کی سخاوت اور نیک دِلی کا ذکر لے بیٹھے۔

ابُو صابر کی تعریفیں سُن کر تیونس کے بادشاہ نے اپنے وزیر کو بُلایا اور کہا:

”میں ابُو صابر کی تعریفیں سُن سُن کر تنگ آ گیا ہُوں۔ ہر جگہ، ہر وقت لوگ اُسی کے گُن گاتے رہتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے مُلک میں اُس کے علاوہ کوئی اور رہتا ہی نہیں۔ میں کِسی بھِکاری کو خیرات میں اشرفی دیتا ہوں تو وہ کہتا ہے، کل ہی ابُو صابر نے اُس سے دو گنی اشرفیاں مجھے دی تھیں۔ کوئی کہتا ہے کہ ابُو صابر نے اتنے

ہزار روپے یتیم خانے کو دیے، اِتنی ہزار اشرفیاں فُلاں ہسپتال کو دیں۔ میں حیران ہُوں! کیا یہ سچ ہے؟"

"یہ بالکُل سچ ہے، بادشاہ سلامت۔"

"میری رعایا میری تعریفیں کیوں نہیں کرتی؟" بادشاہ نے پُوچھا۔ "میں بھی تو خیرات کرتا ہوں۔"

وزیر نے کوئی جواب نہ دیا۔ چُپ رہنے میں ہی عقل مندی تھی۔ بادشاہ پھر بولا:

"مُلک میں جو کچھ ہو رہا ہے، اُس کی خبر رکھنا آپ کا فرض ہے۔ میں اُس شخص کی سخاوت اور نیکی کی باتیں سُننے کے لیے تیّار نہیں۔ اب اس کا بندوبست کرنا آپ کے ذمّے ہے۔"

وزیر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اُس کے دماغ میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کِس طریقے سے ابُو صابر کو ذلیل کیا جا سکتا ہے۔ پھر وہ مُسکرانے لگا اور بولا:

"حضور، میرے ذہن میں ایک بہُت اچھّی ترکیب آئی ہے؟" "کہیے؟" بادشاہ

نے بے چینی سے پُوچھا۔

"حضور، لوگ کہتے ہیں کہ ابُو صابر سے جتنا روپیہ مانگو وہ دے دیتا ہے۔ ہمیں اُس سے رُوپیہ مانگنا چاہیے۔ میں خُود اُس کے پاس جاؤں گا اور کہوں گا کہ شاہی خزانہ بالکُل خالی ہو چُکا ہے۔ حکُومت کنگال ہو چُکی ہے۔ ٹیکس میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ ٹیکس بڑھانے سے غریب لوگ برباد ہو جائیں گے۔ میں ابُو صابر سے کہوں گا کہ وہ حکُومت کے خزانے کے لیے کچھ رقم دے۔ میں اُس سے اتنا روپیہ مانگوں گا کہ اُس کا خزانہ بالکل خالی ہو جائے۔"

بادشاہ یہ ترکیب سُن کر بہت خوش ہوا اور وزیر کو شاباش دیتے ہُوئے کہا:

"بُہت خُوب! بُہت اچھّے! اگر اُس نے اِنکار کر دیا تو سارے مُلک میں اُس کی بدنامی ہو گی۔ پھر وہ یہ نہیں کہہ سکے گا کہ ہر چیز اللہ کی ہے، اور اُس کو اللہ کی راہ میں، اللہ کے بندوں پر خرچ کرنا چاہیے۔"

خُوب صلاح مشورہ کر کے وزیر ابُو صابر کے پاس گیا اور کہا، جتنی دولت تُمہارے پاس ہے سرکاری خزانے میں جمع کرا دو ورنہ مُلک تباہ ہو جائے گا۔ لوگ بھُوکے

مر جائیں گے۔ کیا ہم سب اللہ کے بندے نہیں؟"

ابُو صابر نے کہا۔ "ہاں، ہم سب ایک ہی اللہ کے بندے ہیں۔ میرا ایک ایک پیسا اللہ کے بندوں کے لیے ہے۔ آپ لے جائیے۔"

وزیر نے اُسی وقت ابُو صابر کی دولت، جائداد، مال مویشی، غرض جو کُچھ بھی اُس کے پاس تھا، سمیٹا اور بادشاہ کے خزانے میں داخل کر دیا۔ ابُو صابر نے مُنہ سے ایک لفظ نہ نکالا۔ یُوں لگا تھا اسے کوئی پروا نہیں۔

بادشاہ نے سُنا کہ ابُو صابر نے سب کُچھ وزیر کے حوالے کر دیا ہے تو اُسے بُہت غُصّہ آیا۔ اُس نے وزیر سے کہا:

"اس طرح تو لوگ اُس کی زیادہ تعریف کرنے لگیں گے اور مُجھے بُرا بھلا کہیں گے۔"

وزیر پھر سوچنے لگا۔ آخر بولا "حضور، ابُو صابر جس محل میں رہتا ہے، کیوں نہ وہ بھی مانگ لیا جائے۔ میں کہوں گا کہ حکُومت تُمہارے گھر میں غریبوں کے لیے

ہسپتال بنانا چاہتی ہے۔ اس طرح وہ اور اس کے بیوی بچّے گلیوں میں مارے مارے پھریں گے۔ نہ جیب میں پیسا ہو گا، نہ سر پر چھت۔ پھر وہ قِسمت کو کوستا پھرے گا۔"

بادشاہ کو وزیر کی یہ تجویز پسند آ گئی۔ اگلے روز وزیر نے ابُو صابر کے گھر پر بھی قبضہ کر لیا اور وہ بے چارہ بیوی بچّوں سمیت دَر دَر کی ٹھوکریں کھانے لگا۔ اب تو اُس کے پاس پیسا تھا، نہ رہنے کی جگہ۔ کبھی کہیں رات گزارتا، کبھی کہیں۔ دِن کے وقت محنت مزدوری کرتا۔ جو کُچھ ملتا اُس سے اپنا اور بیوی بچّوں کا پیٹ پالتا اور خُدا کا شکر ادا کرتا۔

بادشاہ نے ابُو صابر کو اب بھی خُدا کا شکر ادا کرتے سُنا تو وزیر کو بُلایا اور اُس سے کہا:

"تُمہاری یہ ترکیب بھی ناکام ہوئی۔ اپنا سب کُچھ گنوا کر بھی وہ اُسی طرح خوش ہے اور اللہ کی تعریف کرتا ہے۔ اُس کے خلاف ایک لفظ تک نہیں کہتا۔ لوگ اُسے ولی سمجھنے لگے ہیں۔"

وزیر نے ایک اور تجویز پیش کی۔ "حضور، ہمیں چاہیے کہ اُس کی بیوی بچّوں کو

بھی اُس سے چھین لیں۔ پھر میں دیکھوں گا کہ وہ کِس طرح خُدا کی تعریفیں کرتا ہے۔"

وزیر نے اُسی وقت حکم جاری کیا کہ ابُو صابر کی بیوی اور چار چھوٹے بچّوں کو محل میں لایا جائے۔ ابُو صابر کی بیوی نے شوہر سے کہا:

"آپ سب کُچھ تو بادشاہ کو دے چُکے ہیں، اب بیوی بچّے بھی اُس کے حوالے کر رہے ہیں۔ بادشاہ سے کہیے کہ وہ آپ کا خاندان تو نہ اُجاڑے۔ مُجھے اُمّید ہے وہ مان جائے گا۔"

"یہی خُدا کی مرضی ہے، بی بی۔" ابُو صابر نے بیوی کو تسلّی دی۔ "اللہ پر بھروسا کرو۔ وُہی مُشکلیں آسان کرے گا۔"

بیوی غصّے سے بولی۔ "میں نے خواہ مخواہ آپ پر بھروسا کیا۔ آپ تو اپنے حق کے لیے اُنگلی تک نہیں اُٹھا سکتے۔ بیوی بچّوں کی حفاظت نہیں کر سکتے۔"

ابُو صابر کی بیوی اور چاروں بچّوں کو بادشاہ کے محل میں لے جایا گیا اور اُن پر

پہرے لگا دیے گئے۔ ابُو صابر کو یہ بھی معلُوم نہ ہُوا کہ وہ زندہ ہیں یا نہیں۔
دوست پُوچھتے تو وہ یہی کہتا:

”درخت سے پتّے بے شک جُدا ہو جائیں، تنا اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ بچّے اللہ کی چیز ہیں۔ اُس نے مُجھ سے چھین لیے ہیں۔ میں اُن کے لیے نہیں روؤں گا۔ اللہ کی تعریف کرو۔ سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔“

اب وزیر کے سامنے یہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ ابُو صابر کو مُلک سے نِکلوا دے۔ اُس کے حکم پر ابُو صابر کو ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک بحری جہاز میں ڈال دیا گیا جو افریقہ کے ساحل کے ساتھ ساتھ تیونس سے دُور نِکل گیا۔ اِس طرح ابُو صابر کو کسی اجنبی مُلک پہنچا دیا گیا۔ اب وہ بالکل اکیلا تھا۔ خالی ہاتھ، خستہ حال، مگر پھر بھی یہی کہتا تھا:

اَلحَمدُ لِلّٰہ۔ اِن پھٹے ہوئے کپڑوں میں مَیں اپنے مُلک میں نہیں، ورنہ لوگ میرا مذاق اُڑاتے۔ یہاں مُجھے کوئی نہیں جانتا اور میں زندگی کو نئے سِرے سے شروع کر سکتا ہوں۔“

وُہ ساحل سے اُٹھ کر کسی قریبی گاؤں کی طرف چل دیا۔ کُچھ کھجوریں مانگ کر کھائیں۔ پھر پانی پیا۔ وہاں سے چل کر شہر میں پہنچ گیا۔ یہاں اُسے راج کا کام مل گیا۔ وہ سارا دِن کام کرتا مگر بہت کم اُجرت ملتی کیوں کہ اُس کو راج کا کام اچّھی طرح نہیں آتا تھا۔ سخت کام سے وہ بُری طرح تھک جاتا اور ہاتھوں میں چھالے پڑ جاتے۔

اسی طرح کئی مہینے گُزر گئے۔ خوش قسمتی سے بڑے راج کو شاہی محل میں کام کرنے کے لیے بُلایا گیا۔ بادشاہ نے راج کو حکم دیا کہ محل سے گرد اُونچی سی چار دیواری بنا دو تاکہ گُزرنے والوں کی نظر اندر نہ پڑے۔

ابُو صابر پردیسی تھا۔ اُسے معلُوم نہ تھا کہ اِس مُلک کا بادشاہ ظالم اور بے رحم ہے۔ کئی برس پہلے اُس نے اپنے بھائی سے حکُومت چھینی تھی اور اُس کو کال کوٹھڑی میں قید رکھا تھا۔ وہ اُسے صِرف اس قدر کھانا دیتا کہ وُہ زندہ رہ سکے۔

رِعایا اس ظالِم بادشاہ سے نفرت کرتی تھی۔ لیکن ان میں بغاوت کرنے کی جرأت نہ تھی۔ بادشاہ نے جاسُوسوں کا جال پھیلا رکھا تھا اور ہر شخص پر شک کرتا تھا۔

ایک روز بادشاہ محل کی کھڑکی میں کھڑا تھا۔ دونوں راج محل کے باہر چار دیواری بنا رہے تھے۔ بڑا راج ابُو صابر کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا اور ابُو صابر اُسے سمجھا رہا تھا:

"سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔ ایک آدمی کا دوسرے آدمی کو گالی دینا عقل مندی نہیں، کیوں کہ اللہ ہی امیر کو غریب اور غریب کو امیر کرنے والا ہے۔"

بادشاہ نے ابُو صابر کی بات سُن لی اور سمجھا کہ یہ آدمی میرے خلاف سازش کر رہا ہے۔ اُس نے فوراً ابُو صابر کو گرفتار کر کے کال کوٹھری میں قید کرنے کا حکم دیا۔"

اسی اندھیری کوٹھڑی میں بادشاہ کا بھائی قید تھا۔ دونوں کو بہت کم کھانا دیا جاتا، پھر بھی ابُو صابر خُدا کا شُکر ادا کیا کرتا اور کہتا:

"اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ ہم دو ہیں۔"

ابُو صابر کو قید خانے میں آئے چند دن ہی گُزرے تھے کہ اُس کا ساتھی شہزادہ مر گیا۔ اُس نے شہزادے کو وہیں کال کوٹھری میں دفن کر دیا اور اللہ تعالیٰ سے دُعا

مانگی:

”اے اللہ! اس مظلُوم کو جنّت میں جگہ دے۔“

قیدی کے مرنے کی خبر اُس نے کسی کو نہ دی۔ اب دونوں قیدیوں کا کھانا اُسے ملتا تھا۔

مرحوم شہزادے کی ماں زندہ تھی اور محل کے ایک الگ حصّے میں رہتی تھی۔ وہ اپنے ظالم بیٹے سے کہتی تھی کہ بھائی کو چھوڑ دے اور اُسے کسی دُوسرے مُلک میں بھیج دے، لیکن بادشاہ نہ مانتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس کا بھائی قید خانے میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے۔

آخر تنگ آ کر اُس نے سوچا کہ بیٹے کے لیے اس قید خانے کی زندگی سے موت بہتر ہے۔ اُس نے اپنے پیارے بیٹے کے لیے مُرغ پکایا۔ اور اس میں زہر ملا دیا۔ پھر اپنے نوکر سے کہا کہ قید خانے میں اگر شہزادے کو دے آئے۔ اُس کا خیال تھا کہ اُس کا بیٹا ابھی زندہ ہے۔

بادشاہ ہر شخص پر گہری نظر رکھتا تھا۔ اُسے محل میں ہونے والی ہر بات کی خبر ہوتی تھی۔ جب اس نے نوکر کو ڈھکی ہوئی پلیٹ لے جاتے دیکھا تو گرج کر پُوچھا:

"اس کپڑے کے نیچے کیا چھُپا کر لے جا رہے ہو؟"

"حضُور، بھُنا ہوا مُرغ ہے۔ ملکہ عالیہ نے اپنے ہاتھوں سے تیّار کیا ہے اور حکم دیا ہے کہ آپ کے بھائی کو دے آؤں۔"

"میرے بھائی کو؟" بادشاہ غُصّے سے لال ہو گیا۔ "اِدھر لاؤ۔ قید میں اُسے مُرغ کھلائے جا رہے ہیں۔ مُجھے دو۔ میں کھاؤں گا۔"

بادشاہ نے پلیٹ لی، کپڑا اُتارا اور جلدی جلدی مُرغ کھانے لگا۔

چند لمحوں بعد بادشاہ مر گیا۔ لوگوں نے اُس کا سوگ نہیں منایا۔ سب دل ہی دل میں خُوش تھے۔ اُس کی ماں کو بھی کوئی غم نہ تھا۔ اب تمام وزیر جمع ہو کر قید خانے میں گئے اور قیدی شہزادے کو باہر لا کر تخت پر بٹھا دیا۔ یہ ابُو صابر تھا۔ وہ تخت پر بیٹھتے ہی بولا:

"سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔"

وزیر، نوکر، چاکر، درباری اور غُلام سب نے جھک کر اُسے سلام کیا۔ اِتنا عرصہ قید رہنے سے شہزادے کی شکل کِسی کو یاد نہ رہی تھی۔ وہ ابُو صابر ہی کو شہزادہ سمجھ رہے تھے۔ شاید بادشاہ کی ماں نے پہچان لیا ہو۔ لیکن وہ بھی خاموش رہی۔

اس رات محل میں چراغ جلائے گئے اور بُہت بڑی دعوت کا انتظام کیا گیا۔ لوگ گلی گلی ناچتے پھرتے تھے۔ آتش بازی چھوڑی جارہی تھی۔

ابُو صابر بے شک اچھا راج نہ تھا، لیکن وہ بہت اچھا بادشاہ ثابت ہُوا۔ اُس نے اپنے دربار میں قابل اور عقل مند وزیر رکھے۔ اِس طرح مُلک دن دوگنی، رات چوگنی ترقّی کرنے لگا۔

تخت نشین ہوتے ہی ابُو صابر نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے وطن تیونس کے بادشاہ کو پیغام بھیجا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے پھر مال دار کر دیا ہے۔ اگر میرے بیوی بچّے زندہ ہوں تو میرے پاس بھیج دیے جائیں۔

تیونس کا بادشاہ اپنے کیے پر پچھتایا کرتا تھا۔ جب اُس کو ابُو صابر کا پیغام ملا تو اُس نے فوراً اس نے بیوی بچّے اُس کے پاس بھیج دیے، اُس کی تمام دولت اور جائداد بھی لوٹا دی اور اپنی نا انصافیوں اور زیادتیوں کی معافی بھی مانگی۔